

ماہنامہ الشریعہ

جلد ۱۸ - شمارہ ۱ - جنوری ۲۰۰۷

| | | |
|----|------------------------|--|
| | | کلمہ حق |
| ۲ | رئیس التحریر | تجدد پسندوں کا تصور اجتہاد |
| | | آرا و افکار |
| ۸ | ڈاکٹر محمد امین | دینی مدارس اور جدید تعلیم |
| | | مباحثہ و مکالمہ |
| ۲۰ | ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی | تحفظ نسواں ایک کتاب و سنت کے تناظر میں |
| ۳۲ | یوسف خان جذاب | علامہ اقبال کا تصور اجتہاد اور علمائے کرام |
| ۳۶ | ریحان احمد یوسفی | حدیث نبوی میں 'اخوان' کا مصداق |
| ۳۹ | حافظ برہان الدین ربانی | ذبیح حضرت اسماعیل یا حضرت اسحاق؟ |
| ۴۲ | - | مکاتیب |
| | | وفیات |
| ۴۸ | محمد عاصم نعیم | مولانا صفی الرحمن مبارک پوری |
| | | اخبار و آثار |
| ۴۹ | - | الشریعا کادمی کی سرگرمیاں |

”اسلامی قوانین پورے اسلامی نظام کے وجود کا ایک حصہ ہیں اور اپنا الگ فلسفہ، اساسیات، اصول اور منہاج رکھتے ہیں۔ ان کی اثر آفرینی کے لیے ضروری ہے کہ انہیں پورے اسلامی نظام کی تمام اساسیات، منہاج اور اصول کے ساتھ نافذ کیا جائے۔“

[مباحثہ و مکالمہ]

تجدد پسندوں کا تصور اجتہاد

بخاری شریف میں ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم پہلی امتوں کے نقش قدم پر چلو گے، حتیٰ کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ (صحرائی جانور) کے بل میں گھسا ہے تو تم بھی ضرور گھسو گے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کیا پہلی امتوں سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ 'تو اور کون ہے؟'

اس حدیث مبارک کی تشریح میں محدثین کرام نے مختلف پہلو ذکر کیے ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ یہود و نصاریٰ نے جس طرح توراہ، انجیل اور زبور میں تحریفات کا راستہ اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں میں معنوی تبدیلیوں اور خدائی احکام کو اپنی خواہش کے سانچے میں ڈھالنے کے ساتھ ساتھ ان کے الفاظ تک بدل ڈالے اور آسمانی تعلیمات سے انحراف کی جو صورتیں انہوں نے اختیار کیں، مسلمانوں میں بھی ایسے گروہ ہوں گے جو اس ڈگر پر چلیں گے اور قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنی خواہش یا فہم و دانش کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اسی طرح کی صورتیں اختیار کریں گے۔ چودہ سو سال کی تاریخ گواہ ہے کہ اس کے لیے بیسیوں گروہ آئے جنہوں نے قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو نئے نئے معانی پہنانے کی کوشش کی اور یہود و نصاریٰ کی یاد تازہ کر دی۔ البتہ قرآن و سنت کے الفاظ میں رد و بدل کی سہولت انہیں کبھی حاصل نہیں رہی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت اپنے ذمہ لے کر اس کے ساتھ اس کی عملی تشریح کے طور پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت کو بھی قیامت تک محفوظ رکھنے کا اہتمام کر دیا۔ اس لیے مسلمانوں میں ایسے گروہوں کا سارا زور معنوی تحریف پر صرف ہوتا چلا آ رہا ہے اور علامہ اقبالؒ کے بقول "خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں" کے مصداق قرآنی تعلیمات ایسے گروہوں کی تحریفی تلمیحات کا مسلسل شکار ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام کا حصہ ہے کہ امت مسلمہ کی غالب اکثریت اور اجتماعی دھارے نے اپنے لیے "اہل السنۃ والجماعۃ" کا ٹائٹل اختیار کر کے اس تحریف و تلمیحات کے راستے میں بھی مضبوط اور ناقابل شکست دیوار کھڑی کر رکھی ہے کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور جماعت صحابہؓ کو دین کی تعبیر و تشریح کا حتمی معیار تسلیم کر لینے کے بعد کسی ایسی تحریف و تلمیحات کا راستہ کھلا نہیں رہ جاتا جس پر چل کر یہود و نصاریٰ کی طرح قرآن و سنت کو من مانے معانی اور خود ساختہ تعبیر و تشریح کا جامہ پہنایا جاسکے۔ البتہ یہ کشمکش مسلسل جاری ہے اور قیامت تک اسی طرح چلتی رہے گی۔

اس پس منظر میں ہمارے "تجدد پسند" دانش وروں کی فکری و علمی کاوشوں پر نظر ڈالی جائے تو اس کا ایک اور دلچسپ

پہلو سامنے آتا ہے جس کا ہم آج کی محفل میں مختصر تذکرہ کرنا چاہ رہے ہیں اور وہ یہ کہ پندرہویں صدی عیسوی میں مغرب میں نصاریٰ کے بعض علمائے، جن میں جرمن مسیحی راہنما مارٹن لوتھر سرفہرست ہیں، پاپائے روم کے خلاف بغاوت کی اور پاپائیت کے نظام کو چیلنج کرتے ہوئے بائبل کی تعبیر و تشریح کا ایک نیا سسٹم قائم کیا جس کی بنیاد پر پروٹسٹنٹ فرقہ وجود میں آیا اور پاپائے روم کے کیتھولک فرقہ کے ساتھ مارٹن لوتھر کے پروٹسٹنٹ فرقہ کی یہ کشمکش بائبل کی تعبیر و تشریح اور مسیحی تعلیمات کے سوسائٹی پر عملی اطلاق کے حوالہ سے مسلسل چلی آ رہی ہے۔

ہمارے بعض دانش ور دوستوں کے دل میں بھی یہ خیال آیا کہ ہم آخر کیوں ایسا نہیں کر سکتے کہ دین کی تعبیر و تشریح کے اب تک صدیوں سے چلے آنے والے فریم ورک کو چیلنج کر کے اس کی نفی کریں اور مارٹن لوتھر کی طرح قرآن و سنت کی نئی تعبیر و تشریح کی بنیاد رکھیں چنانچہ انہوں نے بھی ”ری کنسٹرکشن“ کے جذبہ کے ساتھ مارٹن لوتھر کی ”قدم بہ قدم“ پیروی کا راستہ اختیار کیا اور قرآن و سنت کی تعبیر نو کے کام کا آغاز کر دیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا کام مارٹن لوتھر کی وفات کے فوراً بعد اکبر بادشاہ کے دور میں شروع ہو گیا۔ لوتھر کی وفات ۱۵۴۶ عیسوی میں ہوئی، جبکہ اکبر بادشاہ کی ولادت کا سن ۱۵۴۲ عیسوی ہے۔ گویا عالم اسلام میں لوتھر کے نقش قدم پر چلنے کے لیے جلال الدین اکبر، لوتھر کی زندگی میں ہی جنم لے چکا تھا۔

اکبر بادشاہ کی ابتدائی زندگی ٹھیکہ مذہبی تھی، مگر درباری قسم کے علما و دانش وروں کی مذہبی حرکات نے اس کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ دین اسلام کو ایک ہزار سال ہو چکے ہیں اور اس کی تعبیر و تشریح پرانی ہو گئی ہے جس کی تجدید ضروری ہے اور اب کوئی ایسا ”مجتہد مطلق“ سامنے آنا چاہیے جو دین کی نئی تعبیر و تشریح کے لیے اتھارٹی کی حیثیت اختیار کرے اور اس کی بات کو دین کے معاملے میں فیصلہ کن تصور کیا جائے، چنانچہ اس نے اس مقصد کے لیے سب سے پہلے علمائے امت کے اس اجتہادی نظام کو چیلنج کیا جس نے دین کی تعبیر و تشریح کو ایک مربوط نظام سے وابستہ کیا ہوا تھا اور جس کی موجودگی میں دین کے کسی حکم کی کوئی ایسی تشریح ممکن نہ تھی جسے مارٹن لوتھر کی تعبیرات و تشریحات کی طرح ”ری کنسٹرکشن“ قرار دیا جاسکے، چنانچہ اس نے اپنے لیے اجتہاد مطلق کا منصب ضروری خیال کیا اور خود اس کے ایک درباری عالم ملا عبدالقادر بدایونی نے ”منتخب النورین“ میں اس محضر نامے کا یہ متن نقل کیا ہے جس پر ملک بھر کے علمائے کرام سے جبراً دستخط کرائے گئے، اور جنہوں نے دستخط کرنے سے گریز کیا، وہ ملا عبداللہ سلطان پوری اور ملا عبدالنبی گنگوہی کی طرح جلاوطنی اور شہادت کے مقام سے سرفراز ہوئے۔ اکبر بادشاہ کو ”مجتہد مطلق“ قرار دینے کا محضر نامہ ملا عبدالقادر بدایونی کے بقول یہ ہے کہ:

”خدا کے نزدیک سلطان عادل کا مرتبہ مجتہد کے مرتبہ سے زیادہ ہے اور حضرت سلطان کہف الانام امیر المؤمنین ظل اللہ علی العالمین ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ سب سے زیادہ عدل والے، عقل والے اور علم والے ہیں۔ اس بنیاد پر ایسے دینی مسائل میں جن میں مجتہدین باہم اختلاف رکھتے ہیں، اگر وہ اپنے ثاقب ذہن اور رائے صائب کی روشنی میں بنی آدم کی آسانیوں کے پیش نظر کسی ایک پہلو کو ترجیح دے کر اس کو معین کر دیں اور اس کا فیصلہ کریں تو ایسی صورت میں بادشاہ کا فیصلہ قطعی اور جماعتی قرار پائے گا اور رعایا اور برابرا کے لیے اس کی پابندی حتمی و ناگزیر ہوگی۔“

اس کے بعد جلال الدین اکبر نے ملا مبارک، ابوالفضل اور فیضی جیسے ارباب علم و دانش کی معاونت و مشارکت سے اسلام کی جو ”ری کنسٹرکشن“ کی، وہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ اس تعبیر نو کی بنیاد اسلام کو محدود ماحول

سے نکال کر مختلف مذاہب کے لوگوں کے لیے قابل قبول بنانے، مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے اور اسلامی احکام و قوانین کو تقلید و جمود کے دائرے سے نکالنے کے تصور پر تھی اور خود اکبر بادشاہ کے درباری عالم ملا عبدالقادر بدایونی کی تصریحات کے مطابق اس کا عملی نقشہ کچھ یوں تھا کہ:

☆ سورج کی پوجا دن میں چار وقت کی جاتی تھی۔

☆ بادشاہ کو سجدہ کیا جاتا تھا۔

☆ کلمہ طیبہ میں لا الہ الا اللہ کے ساتھ ”اکبر خلیفۃ اللہ“ کہنا لازمی کر دیا گیا تھا۔

☆ بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں سے درج ذیل عہد لیا جاتا تھا کہ ”میں اپنی خواہش، رغبت اور دلی شوق سے دین اسلام مجازی اور تقلیدی سے علیحدگی اور جدائی اختیار کرتا ہوں اور اکبر شاہی دین الہی میں داخل ہوتا ہوں اور اس دین کے اخلاص کے چاروں مرتبوں یعنی ترک مال، ترک جان، ترک ناموس و عزت اور ترک دین کو قبول کرتا ہوں۔“

☆ بادشاہ کے مرید آپس میں ملتے تو ایک ”اللہ اکبر“ کہتا اور دوسرا جواب میں ”جل جلالہ“ کہتا۔ یہی ان کا سلام و جواب ہوتا تھا۔

☆ خط کے آغاز میں ”اللہ اکبر“ لکھنے کا رواج ڈالا گیا۔

☆ سود اور جوئے کو حلال قرار دیا گیا، شاہی دربار میں جو گھر بنایا گیا اور شاہی خزانہ سے جواریوں کو سودی قرضے دیے جاتے تھے۔

☆ شراب کی محفلوں میں فقہائے کرام کا مذاق اڑایا جاتا اور اکبر بادشاہ کا درباری ملا فیضی اکثر شراب پینے وقت کہتا کہ یہ پیالہ میں فقہائے ”اندھے پن“ کے نام پر پیتا ہوں۔

☆ ڈاڑھی منڈوانے کا حکم دیا گیا اور ڈاڑھی کا مذاق اڑانے کا رواج عام ہوا۔

☆ غسل جنابت کو منسوخ کر دیا گیا۔

☆ ایک سے زیادہ شادی کو ممنوع قرار دیا گیا۔

☆ سولہ سال سے کم عمر لڑکے اور چودہ سال سے کم عمر لڑکی کا نکاح ممنوع قرار دیا گیا۔

☆ حکم صادر ہوا کہ جوان عورتیں جو کوچہ و بازار میں نکلتی ہیں، باہر نکلتے وقت چاہیے کہ چہرہ یا کھلا رکھیں یا چہرے کو اس وقت کھول دیا کریں۔

☆ زنا کو قانوناً جائز قرار دیا گیا اور اس کے لیے باقاعدہ قحبہ خانے بنائے گئے۔

☆ بارہ سال کی عمر تک لڑکے کا ختنہ کرانے کو ممنوع قرار دیا گیا۔

☆ مردہ کو دفن کرنے کے بجائے یہ حکم تھا کہ خام غلہ اور کچی ایشیوں مردہ کی گردن میں باندھ کر اس کو پانی میں ڈال دیا جائے اور جس جگہ پانی نہ ہو، جلا دیا جائے یا چینبیوں کی طرح کسی درخت سے مردہ کو باندھ دیا جائے۔

☆ سوراور کتے کے ناپاک ہونے کا مسئلہ منسوخ قرار دیا گیا۔ شاہی محل کے اندر اور باہر یہ دونوں جانور رکھے جاتے تھے اور صبح سویرے ان کے دیکھنے کو بادشاہ عبادت خیال کرتا تھا۔

☆ شیر اور بھیڑیے کا گوشت حلال کر دیا گیا جبکہ گائے، بھینس، گھوڑے، بھیڑ اور اونٹ کا گوشت حرام قرار دیا گیا۔
☆ حکم صادر ہوا کہ کوئی ہندو عورت اگر کسی مسلمان مرد پر فریفتہ ہو کر مسلمانوں کا مذہب اختیار کر لے تو اس عورت کو جبراً و قہراً اس کے گھر والوں کے سپرد کیا جائے۔

☆ یہ حکم صادر ہوا کہ علوم عربیہ کی تعلیم ختم کر دی جائے اور نجوم، طب، حساب اور فلسفہ کی تعلیم کو عام کیا جائے۔ عربی پڑھنا عیب سمجھا جانے لگا اور فقہ، تفسیر اور حدیث پڑھنے والے مردود و مطعون ٹھہرائے گئے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے بقول ان اقدامات کے نتیجے میں مدرسے اور مسجدیں سب ویران ہوئے، اکثر اہل علم جلاوطن ہوئے اور ان کی اولاد ناقابل جو اس ملک میں رہ گئی ہے، پابجی گیری میں نام پیدا کر رہی ہے۔
☆ ایسے حروف جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً ث، خ، ع، ص، ض، ط، ظ، ان کو بول چال سے بادشاہ نے خارج کر دیا۔

☆ ملا عبدالقادر بدایونی نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کے بارے میں اکبر بادشاہ کے ایک خطاب کا یہ حصہ نقل کیا ہے کہ آخر اس بات کو عقل کس طرح مان سکتی ہے کہ ایک شخص بھاری جسم رکھنے کے باوجود یکا یک نیند سے آسمان پر چلا جاتا ہے اور راز و نیاز کی نوے ہزار باتیں خدا سے کرتا ہے، لیکن اس کا بستر اس وقت تک گرم ہی رہتا ہے۔ تعجب ہے لوگ اس دعویٰ کو مان لیتے ہیں اور اسی طرح شق القمر وغیرہ جیسی باتوں کو بھی مان لیتے ہیں۔

☆ احمد، محمد، مصطفیٰ وغیرہ نام بیرونی کافروں اور اندرونی خواتین کی وجہ سے بادشاہ پر گراں گزرنے لگے۔ اپنے خاص لوگوں کے نام اس نے بدل ڈالے، مثلاً یار محمد خان اور محمد خان کو وہ رحمت ہی کے نام سے پکارتا تھا۔
☆ علمائے سواپنی تصنیفات میں خطبہ سے بچنے لگے۔ صرف توحید اور بادشاہی القاب کے ذکر پر قناعت کرتے تھے۔ ان کی مجال نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک زبان قلم پر لاتے۔

☆ نماز، روزہ اور حج ساقط ہو چکے تھے اور دیوان خانہ میں کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ علانیہ نماز ادا کر سکے۔
☆ نماز، روزہ اور وہ ساری چیزیں جن کا تعلق نبوت سے ہے، ان کا نام ”تقلیدات“ رکھا گیا یعنی یہ سب حماقت کی باتیں ٹھہرائی گئیں اور مذہب کی بنیاد عقل پر رکھی گئی۔

☆ اسلام کی ضد اور اس کے توڑ پر ہر وہ حکم جو کسی دوسرے مذہب کا ہوتا، اس کو بادشاہ نص قاطع اور دلیل قطعی خیال کرتے۔ بخلاف اسلامی ملت کے کہ اس کی ساری باتیں مہمل، نامعقول، نو پیدا اور عرب مفلسوں کی گھڑی ہوئی خیال کی جاتیں۔

☆ جس کسی کو اپنے اعتقاد کے موافق نہ پاتے، وہ بادشاہ کے نزدیک کشتنی، مردود اور پھینکا رہا ہوا شمار ہوتا تھا اور اس کا نام ”فقیر“ رکھ دیا جاتا تھا۔

مارٹن لوتھر نے پاپائیت اور ملوکیت کے خلاف بغاوت کی تھی اور اس کے کچھ واضح اسباب بھی تھے۔ پاپائے روم کو بائبل کی تعبیر و تشریح میں فیصلہ کن اتھارٹی کا درجہ حاصل تھا اور بات دلیل کی بجائے شخصیت کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ پوپ کو خدا کا نمائندہ تصور کیا جاتا تھا اور اب بھی تصور کیا جاتا ہے۔ مغرب میں اندلس کی اسلامی معاشرت اور تعلیم کے نتیجے میں فکری بیداری

پیدا ہوئی اور سائنسی علوم نے آگے بڑھنا شروع کیا تو کلیسا اس کی راہ میں مزاحم ہوا۔ پاپائیت نے بادشاہ اور جاگیردار کے ساتھ مل کر ظلم و جبر کی تکیوں قائم کر دی اور سائنس کی ترقی کو کفر کے مترادف قرار دیا۔ بادشاہ اور جاگیردار کے مظالم کے خلاف عوام کا ساتھ دینے کے بجائے پوپ نے ظلم و جبر کا ساتھی بننے کو ترجیح دی جس کی وجہ سے بغاوت پیدا ہوئی۔ پوپ کی طرف سے بائبل کی شخصی اور جانبدارانہ تعبیر و تشریح کی مزاحمت کے لیے مارٹن لوتھر آگے بڑھا اور جب دیکھا کہ پاپائیت اپنے عوام دشمن اور علم دشمن طرز عمل میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کے لیے تیار نہیں تو اس نے علم بغاوت بلند کر کے پاپائیت کی نفی کر دی اور پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد رکھی جو مسیحیت کی تشکیل جدید اور بائبل کی نئی تعبیر و تشریح کی اساس بنی۔ مغرب کی معروضی صورت حال ایسی ہی تھی اور مغرب کی یہ ضرورت تھی کہ وہاں یہ تبدیلی آئے، لیکن ہمارے مہربانوں نے یہ دیکھے بغیر کہ مغرب کے اس عمل کے لیے پائے جانے والے اسباب ہمارے پاس موجود ہیں یا نہیں اور ہماری معروضی صورتحال اس کی متقاضی ہے یا نہیں، صرف اس شوق میں کہ چونکہ مغرب نے اپنے مذہب کی تشکیل نو کی ہے اور مسیحیت کی تعبیر و تشریح کے قدیمی فریم ورک کو مسترد کر دیا ہے، اس لیے ہمیں بھی یہ کام ضرور کرنا ہے اور جیسا کہ بخانی کا ایک محاورہ ہے کہ پڑوسی کا منہ سرخ ہو تو اپنا منہ تھپڑ مار مار کر سرخ کر لیا جائے، ہم نے اپنے ہی منہ پر تھپڑ برسانا شروع کر دیے جو اب تک مسلسل برستے چلے جا رہے ہیں۔

ہمارے جدت پسندوں نے دو مفروضوں پر اپنی فکری کاوشوں کی بنیاد رکھی۔ ایک یہ کہ انہوں نے مسیحیت کے پاپائی سسٹم کی طرح اسلام کی تعبیر و تشریح میں فقہاء کے قائم کردہ فریم ورک کو بھی پاپائیت قرار دے دیا، حالانکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پاپائیت میں فاضل اتھارٹی شخصیت کو حاصل ہے اور اسے خدا کا نمائندہ تصور کیا جاتا ہے جبکہ اسلام میں خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں اس بات کی یہ کہہ کر نفی کر دی تھی کہ میں قرآن و سنت کے مطابق چلوں گا تو میرا ساتھ دو اور اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ یہ فرما کر حضرت صدیق اکبرؓ نے شخصیت کے بجائے دلیل کی بالادستی کا اعلان کیا اور جب حضرت ابوبکر صدیق کو کسی نے خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا تو انہوں نے فوراً ٹوک دیا کہ میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہوں۔ اس ارشاد کا مطلب بھی پاپائیت کے اس تصور کی نفی تھا کہ کوئی شخص خود کو خدا کا نمائندہ کہہ کر دین کی تعبیر و تشریح میں حتمی اتھارٹی قرار دینے لگے۔

پھر جن ائمہ کرام کے فقہی اصولوں پر سب سے زیادہ تنقید کی جاتی ہے، ان میں سے کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ان کی بات کو صرف اس لیے قبول کیا جائے کہ وہ بات امام ابوحنیفہؒ نے کہی ہے یا امام شافعیؒ نے کہی ہے یا امام مالکؒ نے کہی ہے یا امام احمد بن حنبلؒ کا یہ قول ہے۔ اگر کوئی شخص تقلید کا یہ معنی سمجھتا ہے تو وہ سرے سے اجتہاد اور تقلید کے مفہوم سے واقف نہیں ہے، اس لیے کہ امام ابوحنیفہؒ کی بات کو قبول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی دلیل، قبول کرنے والے کے نزدیک زیادہ وزن رکھتی ہے اور امام شافعیؒ کی بات کو ان کے پیروکار ترجیح دیتے ہیں تو اس کے پیچھے یہی ذہن کار فرما ہوتا ہے کہ ان کی دلیل دوسروں سے زیادہ وزنی ہے۔

جب ہر امام کے پیروکار یہ کہہ کر ان کی بات کو قبول کرتے ہیں کہ ان کی بات صحیح ہے مگر اس میں خطا کا احتمال بھی موجود ہے اور جب یہ منظر سب کے سامنے ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے بیٹھ کر ان کے شاگردان سے اختلاف کر رہے ہیں

اور دلیل کی بنیاد پر ان کے قول کے بجائے اپنے استدلال کو ترجیح دے رہے ہیں تو اس سارے عمل کو پابائیت کے مترادف قرار دینے والے دوست یا تو پابائیت کے مفہوم سے آگاہ نہیں ہیں اور یا پھر اجتہاد اور تقلید کے مسلمہ فریم ورک کے ادراک سے محروم ہیں، اس لیے کہ پاپائے روم کی بات کو قبول کرنے کی بنیاد ان کی شخصیت ہے اور ائمہ مجتہدین کے ارشادات کو قبول کرنے کی اساس ان کی دلیل اور استدلال ہے۔ اتنی واضح سی بات اگر کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تو اس میں اجتہاد اور تقلید کے فریم ورک کا کیا تصور ہے؟

اس حوالے سے ہمارے جدت پسندوں کا دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ دین کی تعبیر و تشریح کے لیے اس کی تعبیر و تشریح کے پرانے فریم ورک کو چیلنج کرنا اور اس کی نفی کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ مارٹن لوتھر نے ایسا ہی کیا تھا جبکہ دین کی تعبیر و تشریح کے پرانے فریم ورک نے جسے اجتہاد اور تقلید کے نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے، کبھی پابائیت کی طرح وقت کی ضروریات کو اپنے ساتھ ایڈجسٹ کرنے سے انکار نہیں کیا اور جب بھی ضرورت پیش آئی ہے، اجتہاد اور تقلید کے نظام میں ایسی کچک اور گنجائش موجود رہی ہے کہ وقت کے تقاضوں کو اس میں سمو یا جاسکے اور چودہ سو سال کے طویل دور میں کسی ایسے مرحلے کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی کہ اجتہاد اور تقلید کے روایتی نظام نے قرون مظلمہ کی پابائیت کی طرح علم کی ترقی میں رکاوٹ ڈالی ہو، سائنس کے ارتقا کی مخالفت کی ہو، جاگیردار اور بادشاہ کی طرفداری اس طرح کی ہو کہ پورے کا پورا اسٹیم ظلم و جبر کا پشت پناہ بن گیا ہو۔ افراد کی بات الگ ہے، ظالم حکمرانوں کو افراد ضرور ایسے ملتے رہے ہیں جو دین کے نام پر ان کے ظلم و جبر کو سند جواز فراہم کرتے رہے ہیں، لیکن پابائیت کی طرح دین کی تعبیر و تشریح کا پورا نظام ظلم و جبر کا ساتھی بن گیا ہو، اس کی ایک مثال بھی پوری تاریخ اسلام میں پیش نہیں کی جاسکتی، جبکہ اس کے برعکس اسلام کے مجتہدین نے حق کی خاطر، عوام کے حقوق کی خاطر، اور ظلم و جبر کے خلاف ہر دور میں جیلیں آباد کی ہیں، پھانسی کے تختے کو چوما ہے اور ظلم و جبر کا حوصلہ و استقامت کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اس لیے دین کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد و تقلید کے روایتی نظام کو کسی بھی حوالہ سے پابائیت سے تشبیہ دینا درست نہیں ہے اور ایسا کرنا صحیحاً ظلم اور نا انصافی کے زمرے میں آتا ہے مگر ہمارے جدت پسند مہربان پورے زور کے ساتھ اسے پابائیت قرار دینے پر مصر ہیں، صرف اس لیے کہ دین کی تعبیر و تشریح کے روایتی نظام اور فریم ورک پر پابائیت کی پھبتی کے بغیر اسے چیلنج کرنے اور اسے مسترد کر کے دین کی ”ری کنسٹرکشن“ کا نعرہ لگانے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

اس حوالے سے ابھی بہت کچھ کہنے کی گنجائش بلکہ ضرورت ہے، اور ان شاء اللہ وقتاً فوقتاً ہم اس پر اظہار خیال کرتے رہیں گے۔ سر دست جناب نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد گرامی کی روشنی میں کہ ”تم یہود و نصاریٰ کی قدم بہ قدم پیروی کرو گے“ اس کے صرف ایک پہلو کی طرف ہم قارئین کو توجہ دلا رہے ہیں کہ مارٹن لوتھر نے جو کچھ مسیحیت کی تعبیر نو کے لیے ضروری سمجھا، اس سے قطع نظر کہ ہمارے ہاں اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں اور ہمارے ہاں وہ اسباب جنہوں نے مارٹن لوتھر کو اس کام کے لیے مجبور کیا تھا، پائے بھی جاتے ہیں یا نہیں، اس کی پیروی کو ہر حال میں ضروری تصور کیا جا رہا ہے۔ کیا ”قدم بہ قدم پیروی“ کی اس سے بہتر کوئی مثال پیش کی جاسکتی ہے؟

دینی مدارس اور جدید تعلیم

حیدرآباد سے شائع ہونے والے ماہنامہ بیداری کے مدیر شہیر جناب محمد موسیٰ بھٹو صاحب نے اپنے جریدے کے ستمبر کے شمارے میں مدیر الشریعہ جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب کی شخصیت پر قلم اٹھایا ہے اور اپنے مخصوص اسلوب میں (جس میں وہ شخصیات کو اہم مسائل پر ان کے موقف کے حوالے سے زیر بحث لاتے ہیں) دینی مدارس میں اصلاح اور بہتری کے ضمن میں مولانا زاہد الراشدی (اور بعض دیگر اہل علم) کے اس موقف سے اختلاف کیا ہے جس کی رو سے وہ دینی مدارس میں جدید تعلیم کے شمول کے حامی ہیں۔ چونکہ ہم بھی کئی برسوں سے (تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ کے تحت) پاکستان کے نظام تعلیم و تربیت میں جدید تعلیم میں اصلاح کے علاوہ دینی مدارس کے نظام میں عصری تقاضوں کے حوالے سے اصلاح و بہتری کے لیے نہ صرف سوچ رہے ہیں بلکہ جو کچھ ہم سے ہو سکے عملاً کر رہے ہیں، اس لیے جو موضوع موسیٰ بھٹو صاحب نے چھیڑا ہے، اسے آگے بڑھاتے ہوئے ہم بھی اپنی کچھ معروضات اہل فکر و نظر کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

دینی مدارس میں جدید علوم کی تعلیم دی جائے یا نہ دی جائے؟ اس سے فائدہ ہوگا یا نقصان؟ اور اگر دی جائے تو کس سطح پر، کتنی اور کیسے دی جائے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا آج دینی مدارس چلانے والے علماء کرام اور دینی موضوعات و مسائل پر سوچنے والے دینی اسکالرز کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

مغرب کا دباؤ

ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ اس بحث یا مسئلے کا فوری محرک مغرب کا دباؤ ہے جو بظاہر مطالبہ یہ کر رہا ہے کہ دینی مدارس میں جدید تعلیم دی جائے کیونکہ اس کی رائے میں دینی مدارس میں جو دینی تعلیم اس وقت دی جاتی ہے اور جس طرح دی جاتی ہے اس سے انتہا پسندی اور دہشت گردی جنم لیتی ہے۔ اس لیے مدارس کے ماحول میں رواداری اور کھلا پن پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ معاشرے کے مرکزی دھارے میں کھپ سکیں۔ یہ مغرب کا ظاہری موقف ہے لیکن متعدد عوامل سے اندازہ ہوتا ہے کہ باطن اس کی خواہش یہ ہے کہ دینی مدارس کو غیر موثر کر دیا جائے اور ہو سکے تو ختم ہی کر دیا جائے کیونکہ وہ ایسی شخصیت پیدا کرتے ہیں جو مغربی تہذیب کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کرتی۔ ہمارے ناعاقبت اندیش حکمران مغرب کا یہ دباؤ بلا سوچے سمجھے آگے دینی مدارس تک منتقل کر دیتے ہیں اور جیسا کہ ہم سب کے علم میں ہے کہ

☆ سینئر مدیر، دائرہ معارف اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

حکومت پاکستان نے دینی مدارس کی رجسٹریشن اور ان کے نصابات کی تبدیلی کے لیے متعدد اقدامات کیے ہیں اور مزید کیے جا رہے ہیں اور دینی تعلیم کے وفاقیوں کے سربراہوں کے ساتھ ان کے مذاکرات اور مباحثات ہوتے رہتے ہیں۔ ان مذاکرات کا عمومی رخ یہی ہوتا ہے کہ حکومت اپنے مطالبات منوانے پر زور دیتی ہے اور اہل مدارس کا رویہ مزاحمت کا ہوتا ہے۔ تاہم پچھلے دنوں، ہماری معلومات کی حد تک، مدارس کی اعلیٰ رابطہ کمیٹی نے حکومت کے سامنے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ دینی مدارس ان طلبہ کو جو میٹرک پاس نہیں ہیں، میٹرک پاس کروانے کا اہتمام کریں گے۔ لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے اور بڑے مدارس کی اکثریت نے اپنے طلبہ کے لیے شام کے وقت میٹرک کے علاوہ ایف اے اور بی اے کے مضامین کی تدریس اور امتحانات کی تیاری کا اہتمام بھی شروع کر دیا ہے۔

مخلصانہ مساعی

اب ذرا دوسری طرف آئیے۔ کئی علماء کرام اور دینی اسکالرز جو موجودہ حالات میں دینی مدارس کے کردار کو زیادہ موثر بنانے کے خواہاں ہیں۔ ماضی میں یہ سوچتے رہتے ہیں اور اب بھی سوچتے ہیں کہ مدارس کے نظام تعلیم و نصاب میں عصری حوالے سے اصلاح و تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور کم از کم یہ تو ہونا ہی چاہیے کہ علماء کرام جدید مغربی افکار و علوم کی کنہ و ہیئت سے واقف ہوں کیونکہ جب تک وہ ان کی حقیقت کو نہیں سمجھیں گے ان کا رد بھی نہیں کر سکیں گے۔

دوسروں کو چھوڑیے خود ہم نے ۲۰۰۰ء میں لاہور میں دینی وفاقیوں کے ذمہ داران کے ساتھ مل کر ۱۸ ماہ کی محنت سے دینی مدارس کے نظام تعلیم کے حوالے سے ایک اصلاحی پکیج بنا کر ان سے منظور کروایا اور متبادل نصاب بھی بنا کر پیش کیا۔ اس کے بعد ہم نے ۲۰۰۴ء سے دینی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کا پروگرام بھی شروع کر رکھا ہے جس میں طرق تدریس کے علاوہ انگریزی زبان اور مغربی فکر و تہذیب اور علوم کا تعارفی مطالعہ بھی شامل ہے۔ اندر میں حالات جب ہم نے مدارس میں جدید تعلیم کی قبولیت اور مدارس کے اپنے زیر اہتمام میٹرک، ایف اے، بی اے کے امتحانات دلوانے کا رجحان دیکھا تو ہمیں تشویش ہوئی۔ چنانچہ ہم نے پچھلے سال مولانا زاہد الراشدی صاحب کو تجویز دی کہ آئیے مل کر لاہور میں دینی مدارس کا ایک کنونشن منعقد کرتے ہیں اور یہ مسئلہ وہاں زیر بحث لاتے ہیں کہ دینی مدارس کے جدید علوم کو اسی صورت میں جیسے کہ وہ اس وقت پاکستان کے جدید تعلیمی اداروں میں پڑھائے جا رہے ہیں، اپنا لینے کے نتائج کیا نکلیں گے؟ کیونکہ ہمارے نزدیک دینی مدارس کی اس جدید روش میں بہت سے خطرے پنہاں ہیں اس لیے کہ ہمارے ہاں جدید تعلیم مغربی فکر و تہذیب کا محض چر بہ ہے اور مغرب کی فکر اپنی اصل میں لہذا مغرب ہے لہذا مغرب میں سارے علوم کی اٹھان اور ان کا مواد و ہیئت الحادی اور غیر اسلامی ہے۔ لہذا نہ فکر پر مبنی ان علوم نے جدید تعلیم کے راستے مسلم فکر اور مسلم معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے اور مسلمانوں کی دین سے دوری اور ان کے بے کرداری کا سب سے بڑا سبب یہی جدید تعلیم ہے لہذا ہمارے نزدیک یہ بہت خطرناک امر ہے کہ دینی مدارس نے انہی جدید علوم کو اپنے مدارس میں پڑھانے اور ان کا امتحان دلوانے کا اہتمام شروع کر دیا ہے۔ مولانا زاہد الراشدی صاحب نے، جن کی ان معاملات پر خوب نظر ہے، بلکہ وہ خود بھی فارغ التحصیل علماء کرام کے لیے ایک سالہ کورس منعقد کرتے ہیں، جس میں جدید علوم کا تعارفی مطالعہ انہیں کرواتے ہیں، ہماری اس تجویز کو قبول کر لیا لیکن عملاً کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ پھر ہم نے چند ماہ پیشتر دینی مدارس کے سارے وفاقیوں کے سربراہوں اور ناظمین اعلیٰ کو ایک خط

لکھا اور اس صورت حال میں مضر خطرناک پہلوؤں کی طرف ان کی توجہ مبذول کرواتے ہوئے انہیں اس موضوع پر مل بیٹھنے اور اس کا حل سوچنے کی دعوت دی اور یہ پیشکش بھی کی کہ اگر اصحاب وفاق چاہیں تو ہم تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ کی طرف سے جدید علوم کی ایسی کتب مدون کر کے دے سکتے ہیں جن میں مغرب کی لطیفہ فکر کا زہر نہ ہو اور وہ ٹھیکہ اسلامی نقطہ نظر پر مبنی ہوں۔ اس کے جواب میں وفاق المدارس العربیہ کے ناظم اعلیٰ جناب مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب نے ہمیں ایک مدافعتیہ مضمون کا جواب دیا اور اس کی کاپیاں سارے وفاقوں کے صدور و ناظمین کو بھجوائیں، جس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ معاملے کی خطرناکی اور گہرائی تک ان کی نظر نہیں پہنچی۔ دریں اثناء ہمارے بعض شرکاء کا رنہ ہمیں ڈرایا کہ اگر وفاقوں نے سچ سچ ہمیں یہ کام کرنے کا کہہ دیا تو اس کام کے لیے جو وسیع مادی وسائل درکار ہیں وہ ہمیں میسر نہیں ہیں (اور شاید وفاق بھی وہ مہیا نہ کر سکیں) مزید یہ کہ ہم خود ایک دوسرے بڑے دینی پراجیکٹ میں مصروف تھے، چنانچہ ان حالات میں ہم نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اب موسیٰ بھٹو صاحب نے یہ موضوع چھیڑا ہے تو ہم نے مناسب سمجھا کہ اس معاملے کو دوبارہ اٹھائیں تاکہ اس کے فکری اور عملی پہلو زیادہ واضح ہو کر سامنے آسکیں۔

عصری تقاضے

ہمارے نقطہ نظر سے مغرب کے دباؤ سے قطع نظر دینی مدارس کے سامنے چیلنج یہ ہے کہ عصری تقاضوں کے حوالے سے موثر علماء کیسے تیار کیے جائیں؟ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس چیز کا تعین کر لیا جائے کہ یہ ”عصری تقاضے“ کیا بلا ہیں اور ان کی کیا اہمیت ہے؟ کیونکہ بہت سے علماء کرام یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے تو قرآن و حدیث پڑھانا ہے، ہمیں عصری تقاضوں سے کیا لینا؟ دیکھیے! دین نام ہے اس ہدایت کا ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں کو اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے عطا فرماتا ہے تو گویا دین کا ہماری دنیوی زندگی سے گہرا ربط اور تعلق ہے بلکہ دین ہے ہی زندگی گزارنے کا لائحہ عمل تاکہ انسان دنیا کی یہ زندگی اللہ کے احکام کے مطابق اس کی عبادت و اطاعت میں گزارے تاکہ آخرت میں اس کی خوشنودی سے بہرہ ور ہو سکے۔

بیخبر کتاب کی جو تمہین کرتا ہے وہ بھی اس ہدایت کو معاشرے کے زندہ حقائق سے مربوط کرنے کا ہی ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ لہذا دین کس مجرد ہدایت کا نام نہیں جس کا زمینی حقائق سے کوئی تعلق نہ ہو بلکہ زندہ مسلم معاشرہ ہی دین کا ہدف اور نمائندہ ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کردہ مدنی معاشرہ اسلام کے استحکام اور اشاعت کا سبب بنا کیونکہ وہ صحیح اسلام کا نمائندہ تھا اور آج چونکہ صحیح اسلامی فرد اور معاشرہ موجود نہیں اس لیے غیر مسلم اسلام سے متاثر نہیں ہوتے حالانکہ ہمارے پاس وہی قرآن و سنت موجود ہیں جو صحابہ کرامؓ کے پاس تھے۔ خلاصہ یہ کہ دین کو عصری حوالے کے بغیر پیش کیا ہی نہیں جاسکتا۔

یہاں ہمیں دینی مدارس چلانے والے علماء کرام کی فطانت سے توقع ہے کہ وہ دو چیزوں میں فرق کریں گے، ایک ہے تقدس اور دوسرے ہے قدامت۔ قرآن و سنت میں تقدس قدامت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ ہمارے دین کا مآخذ ہیں اور ان کی نصوص ناقابل تغیر ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے علوم ہیں وہ محض اپنی قدامت کی وجہ سے ’مقدس‘ نہیں ہو سکتے بلکہ ان کی اہمیت کی وجہ ان کی افادیت ہی ہو سکتی ہے اور اس افادیت میں زبان و مکان کے تغیر سے کمی بیشی ہو سکتی

ہے۔ ہم چند مثالوں سے اپنی بات کی وضاحت کریں گے:

۱۔ دینی مدارس میں جو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے وہ یونانی فلسفہ ہے۔ ایک وقت تھا کہ یونانی فلسفہ مسلمانوں کے لیے چیلنج تھا۔ آج یونانی فلسفے کی بجائے مغربی فلسفہ ہمارے لیے چیلنج ہے تو ہم یونانی فلسفے کی بجائے مغربی (یورپی و امریکی) فلسفہ کیوں نہ پڑھیں پڑھائیں؟

۲۔ برصغیر میں مسلم نظام تعلیم کے انگریزوں کے ہاتھوں خاتمے کے وقت ذریعہ تعلیم فارسی زبان تھی اور اس وقت صرف ونحو اور دوسرے علوم فارسی میں پڑھائے جاتے تھے۔ آج فارسی زبان ہمارے ہاں غیر متداول ہو گئی ہے تو ہم کیوں اصرار کریں کہ اسے ہی ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے اور یہ ضروری ہے کہ صرف ونحو کی کتابیں فارسی ہی میں رہیں۔ پہلے ہم اپنے بچوں کو فارسی پڑھائیں اور پھر فارسی میں لکھی گئی صرف ونحو کی کتابیں!

یہ دو مثالیں ہم نے محض بطور نمونہ مشتبہ از خروارے دی ہیں ورنہ ایسی چیزوں کی فہرست کافی طویل ہے جو مدارس میں عصری حوالے سے تبدیل کیے جانے کے لائق ہیں اور قرآن و سنت کی طرح مقدس اور ناقابل مس (Untouchable) نہیں ہیں کہ ہم ان کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ بلکہ ہم تو عرض کرتے ہیں کہ مدارس میں علوم القرآن و علوم السنہ کے نصابات میں بھی تغیر کی ضرورت ہے اور ان کے طریق تدریس میں بھی اور ہم کوئی نئی بات نہیں کر رہے۔ اہل علم ہمیشہ ان باتوں پر غور کرتے رہے ہیں، مثلاً علامہ ابن خلدون نے اپنے مشہور عالم مقدمہ میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بحث بھی چھیڑا ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیم بچے کو کس عمر میں دینی چاہیے؟ عربی زبان کی باقاعدہ تعلیم سے پہلے یا بعد؟ پھر دونوں صورتوں کے بارے میں تفصیل دی ہے کہ اسلامی دنیا کے کن ممالک میں پہلی صورت پر عمل ہوتا ہے اور کن ممالک میں دوسری صورت پر، اور دونوں کے فائدے اور نقصانات کیا ہیں؟

تو بات عصری تقاضوں کی ہو رہی تھی کہ کبھی عصری تقاضا یہ تھا کہ مدارس میں یونانی فلسفہ اور اس کا رد پڑھایا جائے، آج عصری تقاضا یہ ہے کہ یونانی فلسفے کی بجائے (یا اس کے ساتھ) مغربی فلسفہ اور اس کا رد پڑھایا جائے۔ کبھی عصری تقاضا یہ تھا کہ فارسی ذریعہ تعلیم ہو، آج عصری تقاضا یہ ہے کہ فارسی ذریعہ تعلیم نہ ہو بلکہ پاکستان میں اردو ہو، برطانیہ میں انگریزی ہو اور ایران میں فارسی ہو وغیرہ۔ آج عصری تقاضے کیا ہیں ہم چند اہم امور کی طرف اشارات پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ مسلمان پہلے غالب تھے، آج مغلوب ہو گئے۔ (ایک ضمنی بات۔ ہمارے بس میں ہو تو دینی مدارس کے آخری سالوں میں ایک نئے مضمون کا اضافہ کریں جس میں یہ مسئلہ تفصیل سے زیر بحث آئے کہ مسلمان امت کو زوال کیوں آیا اور وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ کیسے حاصل کر سکتی ہے؟ اور یہ کہ ہمارا تعلیمی نظام اس کا کس حد تک ذمہ دار ہے؟)

۲۔ مغربی فکر اور تہذیب اور اس کے علوم جولادینیت اور الحاد پر مبنی ہیں آج دنیا پر غالب آ گئے ہیں۔

۳۔ مسلم معاشرہ مغربی فکر و تہذیب کے اثرات قبول کر رہا ہے۔ اس کا نظام تعلیم، نظام قانون، نظام معیشت، طرز معاشرت غرض سب کچھ تغیر کی زد میں ہے۔

۴۔ مغرب کا تصور دین ہم سے مختلف ہے لیکن مغرب کے تہذیبی اور سیاسی غلبے کی وجہ سے وہ ہمارے تصور دین کو بھی متاثر کر رہا ہے۔

مندرجہ بالا صرف چند کلیات ہیں۔ ان کے تقاضے کیا ہیں مثلاً علماء کرام اگر مغرب کی لحدانہ فکر و فلسفے کا رد کرنا چاہتے

ہیں اور مسلم معاشرے کو اس کے اثرات بد سے بچانا چاہتے ہیں تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے ان کا مطالعہ کیا جائے اور انہیں سمجھا جائے۔ یہ علوم انگریزی میں ہیں لہذا ضروری ہے کہ انگریزی زبان سیکھی جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا علماء کرام اس نصابی تغیر کے لیے تیار ہیں؟

فقہ کی مثال لیجئے۔ ائمہ اربعہ نے جب فقہی احکام مرتب کیے تھے تو اس وقت کے حالات اور اس وقت کے مسائل ان کے پیش نظر تھے۔ آج نہ وہ حالات ہیں اور نہ وہ مسائل۔ آج عصری تقاضا یہ ہے کہ آج کے حالات اور آج کے مسائل پر غور کیا جائے اور ان کا فقہی حل دریافت کیا جائے۔ کیا دینی مدارس نے اس تغیر کو قبول کیا ہے اور جدید مسائل پر غور و فکر کو اپنے نصاب میں شامل کیا ہے؟

جدید تعلیم کے نصاب کی اہمیت

یہ باتیں ہم نے صرف اس لیے کی ہیں کہ علماء کرام اس بات پر غور فرمائیں کہ عصری تقاضوں کی وجہ سے دینی مدارس کے نظام و نصاب تعلیم میں تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اس اصولی اور عمومی بحث کے بعد اب آئیے دینی مدارس میں جدید علوم کی تدریس کے معین سوال کی طرف۔

☆ کیا دینی مدارس کے طلبہ کو مغربی فکر و علوم کا تعارفی مطالعہ اور انگریزی زبان پڑھانی چاہیے؟ ہمارا جواب ہے، ”ہاں“۔

☆ کیا دینی مدارس کو اس غرض سے وہ کتابیں پڑھانی جائیں جو جدید تعلیمی اداروں میں میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے میں مروج ہیں۔ ہمارا جواب ہے ”بالکل نہیں“۔

ممکن ہے آپ کہیں کہ ہمارے جواب میں تضاد ہے۔ ہم کہتے ہیں بالکل نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مسئلے کو پوری طرح سمجھا جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مغرب کی طہرانہ اور غیر اسلامی فکر و تہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے۔ بد قسمتی سے مسلم معاشرے خصوصاً مسلم حکمرانوں کی کمزوری سے آج کے مسلم معاشرے میں مروج جدید تعلیم اسی مغربی طہرانہ اور غیر اسلامی فکر پر مبنی ہے۔ اب اگر دینی مدارس نے بھی اسی الحادی مغربی فکر و فلسفے کے تحت مرتب کی گئی کتب کو اپنے ہاں پڑھانا شروع کر دیا تو لامحالہ جلد یا بدیر وہ بھی انہی ساری خرابیوں کا شکار ہو جائیں گے جنہوں نے ہماری جدید تعلیم بلکہ ہمارے معاشرے کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے اور اس کے اسلامی افکار و اقدار کو متزلزل اور مضطرب کر کے رکھ دیا ہے۔

یہ بات جو ہم کہہ رہے ہیں کہ غلط اور غیر اسلامی نصاب تعلیم انسانی شخصیت کو مسخ کر دیتا اور معاشرے کو تباہ کر دیتا ہے، ممکن ہے عام لوگ نہ سمجھیں لیکن دینی مدارس کے اہل حل و عقد کو ضرور یہ بات سمجھ میں آجانی چاہیے کیونکہ وہ خود معلم ہیں اور جانتے ہیں کہ جیسی تعلیم ہوتی ہے ویسی ہی ذہنیت اور شخصیت اور ویسے ہی افراد بنتے ہیں اور یہ کہ قوموں کے عروج و زوال اور ان کے بناؤ اور بگاڑ میں تعلیم اور نصاب بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ لہذا انہیں خدا کے لیے معاملے کی نزاکت کا احساس کرنا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ دینی مدارس کو میٹرک، ایف اے، بی اے کی مروجہ کتب نہیں پڑھانی چاہئیں بلکہ ان کی جگہ انہیں خود ایسی کتب مرتب کرنی اور کروانی چاہئیں جو مغربی فکر و تہذیب کے زہر سے آلودہ نہ ہوں۔ اگر وہ اس کا ارادہ اور ہمت کر لیں تو یہ

مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں۔ عملاً اس کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ جدید علوم اپنے طلبہ کو اپنے نظام کے اندر رکھ کر پڑھائیں اور اسے حکومتی ڈگری سے متعلق نہ کریں تو وہ پھر بالکل آزاد ہیں کہ جو کتب چاہیں وہ اپنے ہاں لگائیں اور پڑھائیں، حکومت پاکستان کو اس سے سروکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے تو خوش ہونا چاہیے کہ دینی مدارس جدید علوم پڑھائیں گے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مدارس اپنی خصوصی حیثیت کے پیش نظر میٹرک، ایف اے، بی اے کی اپنی مرتب کردہ کتب حکومت پاکستان سے منظور کروالیں۔ ان کتب کو اس طریقے سے مرتب کیا جاسکتا ہے کہ وہ حکومتی نصاب کے خلاف بھی نہ ہوں لیکن ان میں مغربی تہذیب کا زہر بھی نہ ہو اور وہ اسلامی تقاضوں کے بھی مطابق ہوں (یہ ایک فنی کام ہے اور پیشہ ورانہ مہارت کا تقاضا کرتا ہے اور ہم اپنی اس پیشکش پر قائم ہیں کہ ہم مدارس کے لیے یہ کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔

مقاصد تعلیم میں وسعت کا مسئلہ

دینی مدارس میں جدید تعلیم کے حوالے سے یہاں ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا دینی مدارس اپنے مقاصد تعلیم میں وسعت پیدا کرنے کے لیے تیار ہیں؟ دوسرے لفظوں میں کیا اب بھی وہ صرف مساجد اور مدارس کے لیے علماء تیار کرنا چاہتے ہیں یا معاشرے کو اسلامی خطوط پر چلانے کے لیے اہم شعبوں کے ماہرین پیدا کرنا بھی ان کے پیش نظر ہے؟ اس سوال کی نوعیت اور اہمیت کو سمجھنے کے لیے اس کا پس منظر ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

دیکھیے! انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کر لیا تو بتدریج مسلمانوں کا نظام تعلیم ختم کر دیا اور اپنا نظام تعلیم نافذ کر دیا۔ اس پر اہل فکر و نظر پریشان ہو گئے کہ ہندوستان کا حشر کہیں اندلس جیسا نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے سوچا کہ جیسے تیسے ہو بنیادی دینی علم کو زندہ رکھا جائے تاکہ مسجدیں آباد رہیں اور مسلمان نکاح و طلاق اور غم و خوشی کے روزمرہ کے امور میں دین سے جڑے رہیں۔ چنانچہ علماء کرام نے درختوں کے نیچے بیٹھ کر اور کچی مٹی کے بنے حجروں میں بیٹھ کر قرآن و سنت اور فقہ کی تعلیم دینی شروع کی اور چونکہ قوم اس وقت ہزیمت خوردہ، منتشر اور مفلس تھی اس لیے اس کام سے دنیا وابستہ نہ تھی بلکہ علماء کرام کو ایثار سے کام لیتے ہوئے پیٹ پر پتھر باندھ کر یہ کام کرنا پڑا (جس کے لیے قوم کے سر ہمیشہ علماء کے اس احسان کے سامنے جھکے رہیں گے)۔ یہ اس وقت کے حالات کے دباؤ کا نتیجہ تھا کہ علماء کرام نے یہ تعلیمی پروگرام شروع کیا اور بعد میں جب مسلمانوں نے جدید تعلیم کے اپنے ادارے کھولنے شروع کیے تو دیوبند کے بانیوں خصوصاً مولانا رشید احمد گنگوہی کا خیال ابتداءً یہ تھا کہ وہ اپنے تعلیمی پروگرام کو کچھ مختصر کر کے اپنے طلبہ کو یہ موقع دیں گے کہ دینی تعلیم سے فراغت کے بعد وہ جدید تعلیم کے لیے چند سال فارغ کر سکیں لیکن غاصب انگریز کے خلاف جذبات اس وقت اتنے شدید تھے اور دونوں طرف کی تعلیم کے علمبرداروں کے درمیان سیاسی، سماجی، دینی اور معاشرتی حوالوں سے خلا اتنا زیادہ تھا کہ تعلیمی تبادلے کے اس پروگرام پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ چنانچہ دینی تعلیم دنیوی علوم سے کٹ کر اور جدید تعلیم مغربی فکر و تہذیب کے سانچے میں ڈھل کر آگے بڑھتی رہی۔ ندوہ اور جامعہ ملیہ کی صورت میں باہم انجذاب کی کچھ کوشش ہوئی جو کامیاب نہ ہو سکی اور بدقسمتی سے یہ دونوں تعلیمی دھارے آج تک متوازی انداز میں کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سیاستدانوں اور حکمرانوں کا فرض تھا کہ وہ نظام تعلیم کی وحدت کا انتظام کرتے اور اسلامی تعلیم اور جدید علوم کی مناسب انداز میں یکجائی کا اہتمام کرتے لیکن انہوں نے اس ضمن میں کچھ نہ

کیا۔ عوام اور اسلامی قوتوں کے دباؤ پر انہوں نے صرف اتنا کیا کہ جدید نظام تعلیم میں جو مغربی فکر و تہذیب پر مبنی تھا، کچھ سطحی قسم کی پیوند کاری 'دینیات' کی تعلیم کے اضافے سے کی جو حسب توقع غیر موثر ثابت ہوئی۔ دینی مدارس اور دینی تعلیم ان کا درد سر نہ تھی، چنانچہ نہ کبھی حکومت نے دینی مدارس کی سرپرستی کی، نہ ان کے لیے بجٹ مختص کیا، نہ کبھی ان کے نصابات کی اصلاح کے لیے کچھ کیا اور یوں نہ صرف مدارس سے سرد مہری اور لائق کا رویہ رکھا بلکہ الٹا مغربی حکومتوں کے زیر اثر اپنی سیاسی مصلحتوں کی خاطر انہوں نے دینی مدارس کی مخالفت کی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ارباب دینی مدارس نے بھی اس امر پر غور نہ کیا کہ عہد غلامی میں انہوں نے دینی تعلیم کو صرف مساجد و مدارس تک محدود رکھنے کی جو روش اپنائی تھی اب ایک آزاد مسلم معاشرے میں اس میں تبدیلی کی ضرورت تھی۔ علماء کرام اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں ہمیشہ وحدت رہی ہے۔ دین و دنیا کی الگ الگ تعلیم کا تصور اسلامی دور حکومت میں کبھی بھی نہیں رہا۔ ماضی میں مسلمان معاشرے میں دینی مدارس، نہیں محض مدارس ہوتے تھے جو دینی تعلیم بھی دیتے تھے اور ان علوم کی تعلیم بھی دیتے تھے جن کی مسلمانوں کو دنیا میں ضرورت تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کے مدارس میں دینی تعلیم میں تخصص کے علاوہ سائنسی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی (جیسے طب (میڈیکل)، ہندسہ (انجینئرنگ)، ہیئت (اسٹرانومی اور سپیس سائنس)، کیمیا (کیمسٹری)، حساب (ریاضی و الجبرا وغیرہ)۔ اسی طرح ان مدارس میں سماجی و عمرانی علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی (جیسے فلسفہ، منطق، تاریخ، جغرافیہ، ادب وغیرہ)۔ زبانیں بھی یہاں سکھائی جاتی تھیں چنانچہ عربی کے علاوہ مقامی زبانیں جیسے فارسی، ترکی وغیرہ کی تعلیم بھی عام تھی بلکہ فارسی تو برصغیر میں ذریعہ تعلیم بن گئی تھی۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کے مدارس سے نہ صرف دین کے مخصوص علماء تیار ہو کر دینی شعبے کی خدمت کرتے تھے بلکہ زندگی کے سارے شعبوں کو چلانے کے لیے مردان کار یہیں سے تیار ہو کر نکلتے تھے۔ حکومت چلانے والے منتظم، انصاف کرنے والے جج (قاضی)، مالی شعبے کے ٹیکس کلکٹر، شعبہ تعمیرات کے لیے انجینئر، دھاتوں کو سونے میں بدلنے والے کیمیا گراور علم الافلاک کے ماہر منجم سب انہی مدارس سے نکلتے تھے۔ بلکہ ان مدارس کی ایک بڑی اور بنیادی خوبی یہ تھی کہ مذکورہ بالا شعبوں کے یہ سارے متخصصین دینی علوم کے ماہر اور آج کی زبان میں عالم دین بھی ہوتے تھے۔ گویا یوں کہیے کہ ابتدائی اور عمومی تعلیم کی بنیاد سب کے لیے دینی تھی اور تخصص کے لیے حسب ذوق و ضرورت کچھ لوگ دینی علوم میں سند لیتے تھے، کچھ سائنسی علوم میں اور کچھ عمرانی علوم میں۔

اور آج پھر دینی مدارس کے سامنے سوال یہ ہے کہ ان کا مقصد تعلیم کیا ہونا چاہیے؟ کیا صرف مسجد و مدرسے کے امام و معلم پیدا کرنا یا معاشرے کے لیے درکار دوسرے شعبوں کے ماہرین بھی پیدا کرنا۔ موسیٰ بھٹو صاحب اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ دینی مدارس کو مسجد و مدرسے تک محدود رہنا چاہیے جیسا کہ ہمارے دینی مدارس کی موجودہ پالیسی ہے۔ ہم اس رائے کو صحیح نہیں سمجھتے اور اس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

دین و دنیا کی تعلیم کی علیحدگی کے نقصانات

۱۔ اس پالیسی نے مسلم معاشرے میں دین و دنیا کی تفریق کے تصور کو مستحکم کیا ہے۔ معاف کیجیے گا اسی کو سیکولرزم کہتے ہیں اور یہ سیکولرزم بالبداهت خلاف اسلام ہے۔ ہم مغربی تہذیب کو الزام دیتے ہیں کہ وہ سیکولرزم کی علمبردار ہے اور اس نے بے دینی پھیلائی ہے اور ہم اس امر پر غور نہیں کرتے کہ ہم خود دین کے نام پر جو سیکولرزم پھیلا رہے ہیں کیا اس کا

نتیجہ بے دینی نہیں نکلا؟ اور کیا مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب یہ نہیں کہ ہمارے علماء و صلحاء نے مساجد و مدارس اور خانقاہوں میں ڈیرہ لگا کر سیاست اور اجتماعی زندگی کو بے دینوں کے حوالے کر دیا اور یوں صدیوں سے ہمارا سیاسی نظام برائے نام خلافت کا لبادہ اوڑھ کر منہاج نبوت اور منہاج خلافت راشدہ سے دور ہوا اور آج بھی ہے۔

۲۔ اس پالیسی نے مسلم معاشرے کو مسٹر اور ملا میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس تقسیم کے منفی اثرات بہت دور رس اور گہرے ہیں۔ اس سے مسلم معاشرہ ہی تقسیم نہیں ہوا بلکہ اس کا بنیادی نقصان یہ ہوا ہے کہ اس کی وجہ سے مسلم شخصیت میں وحدت نہیں پیدا ہو پاتی اور یہ علمی و فکری انتشار کو جنم دیتی ہے جو ہماری بے کرداری کا بنیادی سبب ہے۔ موجودہ نفسیات نے یہ ثابت کیا ہے (اور اسلامی علم النفس بھی یہی کہتا ہے) کہ انسانی اعمال کا منبع اس کی فکر ہوتی ہے۔ فکر منظم ہو کر نیت، ارادے اور عزم کے ذریعے عمل کو جنم دیتی ہے، عمل کا دوام عادات بناتا ہے اور جیسی عادات ہوتی ہیں ویسی ہی شخصیت وجود میں آتی ہے۔ لہذا فکر میں یکسوئی اور وحدت شخصیت کی جان ہوتے ہیں۔ آپ دین و دنیا میں تفریق کو قبول کر کے اور مسلمانوں کو جدید تعلیم کے لیے مغربی فکر کے حوالے کر کے (جس کا تصور دین و دنیا اسلام کے بالکل الٹ ہے) مسلم شخصیت کو تباہ کرنے کی بنیاد رکھ دیتے ہیں، لہذا ہم اس معاملے میں بالکل یکسو ہیں کہ ہماری بے کرداری کا بنیادی سبب فکری عدم یکسوئی ہے اور ہماری فکری عدم یکسوئی کا سبب ہمارے نظام تعلیم کی شہویت اور دوئی ہے جس کے کچھ ذمہ دار ہمارے دینی مدارس بھی ہیں، فہل من مدکر؟

۳۔ اس پالیسی نے مسلم معاشرے میں مغرب پرست سیکولر حکمرانوں کے لیے میدان کھلا چھوڑ دیا ہے اور وہ معاشرے کو بڑی آسانی سے بگٹ اپنی مرضی کے مطابق سیکر لبر بنیادوں پر چلانے بلکہ بھگائے جا رہے ہیں کیونکہ دینی عناصر اسلامی ریاست چلانے کے لیے رجال کار پیدا ہی نہیں کر رہے۔ سوال یہ ہے کہ آج کے میڈیا کو اسلامی انداز میں چلانے کے لیے جو آدمی درکار ہیں کیا دینی مدارس وہ آدمی پیدا کر رہے ہیں؟ آج کے معاشرے میں اسلامی انداز میں نظام معیشت چلانے کے لیے جو ماہرین درکار ہیں کیا دینی مدارس وہ اشخاص پیدا کر رہے ہیں؟ اور یہی حال زندگی کے دوسرے شعبوں کا ہے خصوصاً نظام تعلیم، نظام قانون، قضاء، انتظامیہ وغیرہ کا، کہ آپ ان شعبوں کے ماہرین پیدا ہی نہیں کر رہے۔ اس قحط الرجال کا نقصان یہ ہے کہ آج اگر دینی عناصر کو پاکستان میں اقتدار مل بھی جائے تو وہ صحیح اور موثر نظام حکومت چلا کر نہیں دکھا سکتے (جس کا مظاہرہ حال ہی میں دوسو بوں میں دینی عناصر کو اقتدار ملنے کی صورت میں ہوا ہے اور جس کے نتائج سے مایوسی پیدا ہوئی ہے)۔

۴۔ اگر علماء کرام معاف فرمائیں تو ہم عرض کریں گے کہ شہویت پر مبنی اس نظام تعلیم سے معاشرے میں علماء کرام کی بے توقیری ہوئی ہے۔ جاگیر دار اپنی مسجد کے مولوی صاحب کو کہیں سمجھتے ہیں اور دیگر اہل حرفہ موچی، ترکھان، لوہار کی طرح مولوی صاحب کو بھی سالانہ ایک دو من گندم دے کر فارغ کر دیتے ہیں اور بعض دیہات میں تو ابھی تک مولوی صاحب شام کے وقت گھر گھر جا کر روٹی مانگ کر لاتے ہیں اور یوں بچوں کا پیٹ پالتے ہیں اور سرمایہ دار مولوی صاحب کو معمولی ملازم سمجھتے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں میں مسجد کے مولوی اور خطیب زیادہ سے زیادہ دس گیارہ گریڈ کے ملازم ہوتے ہیں جب کہ افسر کا گریڈ ۱۷ سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے افسر مولوی صاحب کو ادنیٰ درجے کا ملازم سمجھنے میں حق بجانب ہیں اور یہ تاثر لینے میں بھی حق بجانب ہیں کہ مولوی بننا اسی سطح کے لوگوں کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ہمارے مدارس اندھوں،

لجوں، ناداروں (جو غریب والدین اپنے بچوں کو پال نہیں سکتے یا سکولوں میں تعلیم نہیں دلا سکتے، وہ انہیں مدرسہ بھجوادیتے ہیں) اور نالائقوں (جو سکولوں میں کسی وجہ سے چل نہیں سکتے) کی آماجگاہ رہے ہیں اور قوم کے کھاتے پیتے لوگ اپنے ذہین بچوں کو یہاں بھجوانا پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ اہل دین کی دنیاوی شوکت سے یہ محرومی معاف کیجئے گا، خود دین کے استخفاف کا سبب بنی ہے اور معاشرے پر اس کے برے اثرات انتہائی گہرے ہیں۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ مولوی صاحب مانگنے والے بن گئے ہیں۔ کوئی بھی سرمایہ دار یا مرفد الحال شخص جب مولوی صاحب کو آتے دیکھتا ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ مولوی صاحب چندہ مانگنے کے لیے آئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ علماء مسجد اور مدرسے کے لیے مانگنے جانتے ہیں اپنی ذات کے لیے نہیں لیکن بقول اقبال..... مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج۔ اور لینے والے ہاتھ کا نیچے ہونا اور دینے والے ہاتھ کا اوپر ہونے کا فلسفہ بہر حال ایک خاص نوع کی ذہنیت اور رویے کو جنم دیتا ہے اور بعض لوگ تو اس امر کو بھی مدارس کی بے برکتی کی ایک وجہ گردانتے ہیں کہ مولوی صاحب کو سرمایہ دار سے مانگتے ہوئے اس سے صرف نظر کرنا پڑتا ہے کہ اس کی کمائی حلال کی بھی ہے یا نہیں، ان کو تو بہر حال مسجد اور مدرسے کو چلانے کے لیے فنڈ زور کار ہوتے ہیں۔

دینی تعلیم کو مسجد اور مدرسے تک محدود رکھنے کے یہ چند بڑے نقصانات جو ہم نے گنوائے ہیں (امید ہے کوئی صاحب ہمارے نیک نیتی پر مبنی اس ناگزیر تجزیے کی بناء پر ہمیں علماء کرام اور دینی مدارس کے استخفاف کا مرتکب قرار نہیں دیں گے) وہ اس قابل ہیں کہ ہمارے دینی مدارس کے اہل حل و عقد ان پر غور فرمائیں اور ان کی بنیاد پر جس استدلال کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اس کا وزن کو محسوس کریں۔

علماء کرام کے خدشات

ہمارے علم میں ہے کہ علماء کرام کی ایک خاصی بڑی تعداد خصوصاً پرانے اور بزرگ علماء ہماری اس تجویز کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔ اس کی وجہ ان کے بعض خدشات ہیں اور وہ اپنے موقف کو صحیح سمجھنے کے لیے بعض دلائل بھی رکھتے ہیں۔ ہم خواہ مخواہ بحث کو طول دینا نہیں چاہتے لیکن جو نقطہ نظر ہم پیش کر رہے ہیں، اس کے اثبات کے لیے ان خدشات و دلائل کا ذکر اور رد ناگزیر ہے۔ اپنے نقطہ نظر کے حق میں علماء کرام جو دلائل اور خدشات رکھتے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

- ۱۔ اگر ہم نے اپنے طلبہ کو انگریزی اور جدید علوم پڑھانے شروع کر دیے تو مسجدیں اور مدرسے ویران ہو جائیں گے اور علماء کی اکثریت دفتروں اور اسکولوں میں ملازمت کر لے گی۔
- ۲۔ ہم پہلے ہی مانگ تا نگ کر اور روپیٹ کر گزارہ کر رہے ہیں، اگر ہم نے جدید علوم بھی پڑھانے شروع کر دیے تو لامحالہ اخراجات بڑھیں گے اور ہم اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔
- ۳۔ یہ حکومتوں کا کام ہے کہ وہ اس سطح کے آدمی تیار کرے۔ ہم اگر اس کام میں لگ گئے تو جو کام ہم کر رہے ہیں وہ بھی متاثر ہوگا اور کمزور ہو جائے گا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دلائل نہیں محض خدشات ہیں اور خدشات بھی ٹھوس نہیں محض خوف پر مبنی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ:

- ۱۔ اس بات میں کوئی وزن نہیں کہ دینی مدارس کے طلبہ کے انگریزی اور جدید علوم پڑھنے سے مدرسے اور مسجدیں

ویران ہو جائیں گی کیونکہ جتنے طلبہ اس وقت سالانہ دینی مدارس سے فارغ ہوتے ہیں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ سب مساجد و مدارس میں کھپ نہیں سکتے لہذا ان میں سے بعض دیگر شعبوں میں چلے جاتے ہیں، بعض بے روزگار رہ جاتے ہیں اور بعض جدید تعلیم حاصل کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں لہذا دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کی ایک تعداد اگر مساجد و مدارس کا رخ نہ بھی کرے تو ان شاء اللہ مسجدیں و مدارس پھر بھی آباد رہیں گے۔

۲۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے مسلم معاشرے میں مغرب کی مادہ پرستی نے خاصا غلبہ حاصل کر لیا ہے اور اعلیٰ معیار زندگی کی دوڑ، راتوں رات امیر بن جانے کا جنون، بیرون ملک جانے کا خبط، تعلیم میں کمرشل ازم کا غلبہ وغیرہ ان سارے رجحانات سے دینی مدارس کے فارغ التحصیل علماء کا متاثر ہونا بہت اچنبھے کی بات نہیں کہ وہ بھی بالآخر اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ اس کے باوجود ان قباحتوں سے بچنے کی کوشش کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ تاہم تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے اور وہ یہ کہ جائز ذرائع سے اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا کوئی جرم نہیں۔ لہذا دینی مدارس سے فارغ ہونے والے علماء کرام کے لیے اگر مدارس و مساجد سے ہٹ کر اچھی ملازمتوں کے مواقع پیدا ہونے کی کوئی صورت بنے تو اسے بالآخر مذموم کیوں سمجھا جائے؟ دین کے لیے ایثار و قربانی بوقت ضرورت بلاشبہ محمود ہے۔ ہمارے علماء کرام یہ ایثار ماضی میں کرتے آئے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی کرتے رہیں گے لیکن علماء کرام کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے سے اگر موجودہ مساجد کمیٹیاں اس امر پر مجبور ہوتی ہیں کہ وہ مساجد کے ائمہ و خطباء کی تنخوااں بڑھائیں تو یہ بھی وقت کی ضرورت ہے اور علماء کرام اس کے مستحق ہیں۔ پھر جیسا کہ ہم نے سعودی عرب میں دیکھا کہ یونیورسٹیوں کے علوم اسلامیہ کے سارے پروفیسر مسجدوں کے خطیب ہیں۔ اسی طرح کالجوں میں بھی پروان چڑھانا چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ علماء کرام خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں ہوں، مساجد کی خطابت (بلکہ امامت بھی) انہی کے پاس ہونی چاہیے۔ اس سے علماء کا وقار بھی بڑھے گا، ان کی آمدنی بھی بڑھے گی اور مساجد کا کردار بھی پہلے سے زیادہ موثر ہو جائے گا جو ہماری فوری دینی اور معاشرتی ضرورت ہے۔

۲۔ مقاصد تعلیم میں توسیع سے بلاشبہ مدارس کے اخراجات بڑھیں گے لیکن جو قوم اس وقت بھی دینی مدارس کو کروڑوں نہیں بلکہ کئی ارب روپے سالانہ امداد دیتی ہے، جب وہ دیکھے گی کہ دینی مدارس کا کردار معاشرے کے لیے زیادہ موثر اور وسیع ہو گیا ہے تو وہ یقیناً مدارس کی اضافی ضروریات بھی پوری کرے گی۔ الحمد للہ! کہ مدارس کی اکثریت معاشرے کے اعتماد کی حامل ہے اور لوگ محض ثواب کی خاطر مدارس کی امداد کرتے ہیں۔ قوم کھلی آنکھوں سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ اس لیے ہم نہیں سمجھتے کہ اگر دینی مدارس اپنے مقاصد تعلیم میں توسیع کا فیصلہ کریں تو قوم انہیں مایوس کرے گی۔

دوسری بات یہ کہ چھٹی دو تین دہائیوں میں معاشرے کے رجحان میں یہ تبدیلی محسوس کی گئی ہے کہ اب نادار لوگوں کے علاوہ (جو اپنے بچے مجبوراً دینی مدارس میں بھجواتے تھے)، اب بعض متوسط طبقے کے اور بعض کھاتے پیتے گھروں کے بچے بھی دینی مدارس میں آنے لگے ہیں جو کسی مجبوری سے نہیں بلکہ اپنی خوشی و مرضی سے مدارس میں دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ لہذا اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مدارس میں 'منفعت تعلیم' کے تصور پر بھی نظر ثانی کی جائے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کے لیے باقاعدہ فیس مقرر کی جائے بلکہ درمیان کے راستے بھی سوچے جاسکتے ہیں مثلاً ایسے کھاتے پیتے والدین کو مدرسے کے وقف کی رکنیت دے دی جائے (اور ایسی رکنیت کو عام کر دیا جائے) والدین مدرسے کے آمد و خرچ سے آگاہ

ہوں اور ہر ماہ یا ہر سال اپنی مالی حیثیت کے مطابق مدرسہ کے وقف کی مدد کرتے رہیں تاکہ مدرسہ کے اخراجات پورے ہوتے رہیں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے لہذا جب مدارس اپنے منہاج میں تبدیلی کریں گے تو سب متعلقہ لوگ اس پر سوچیں گے اور ذرائع آمدنی کے حصول کے لیے بھی کئی دوسرے راستے ان شاء اللہ سامنے آئیں گے اور خدا نخواستہ یہ صورت نہیں بنے گی کہ دینی مدارس مالیات نہ ہونے کی وجہ سے کام بند کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ انڈونیشیا اور بنگلہ دیش میں اس ضمن میں کامیاب تجربے ہوئے ہیں۔

۳۔ تعلیم خواہ دینی ہو یا دنیوی اور خواہ ابتدائی سطح کی ہو یا اعلیٰ سطح کی بلاشبہ حکومت کی ذمہ داری ہے لیکن ہماری تیرہ سو سالہ تاریخ گواہ ہے کہ علماء نے کبھی بھی اس کے لیے حکومتوں پر انحصار نہیں کیا اور وہ معاشرے کی مدد سے کیونٹی کو متحرک کر کے ہمیشہ مسلم عوام کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے رہے ہیں اور مسلمان علماء و صلحا نے پرائیویٹ سیکلر میں ہزاروں مدارس اور خانقاہیں قائم کر کے تعلیمی و تربیتی نظام کو قائم و دائم رکھا ہے۔ خود برصغیر کی تعلیمی روایت بھی یہی ہے کہ یہاں حکومتی سرپرستی سے محروم ہونے کے باوجود مسلم ملت نے دیوبند، ندوہ، علی گڑھ، جامعہ ملیہ، انجمن حمایت اسلام، اسلامیہ کالج پشاور وغرض ایک پورے تعلیمی نظام اور نیٹ ورک قائم کیا اور چلایا۔ اب بھی اگر حکومت یہ کام نہیں کرتی تو علماء کرام کو حکومت کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہیے اور اس کے لیے حکومت پر انحصار کرنا ہی نہیں چاہیے۔ جس طرح وہ مساجد و مدارس کے لیے حکومتی مدد کے بغیر آج تک افراد کا مہیا کرتے آئے ہیں اگر وہ ہمت کر کے اپنا دائرہ کار امت کے مفاد میں وسیع کر لیں تو وہ ان شاء اللہ اس کو بھی کامیابی سے چلا لیں گے جیسے کہ ہمارے اسلاف ماضی میں کرتے آئے ہیں۔ لہذا یہ کوئی نیا کام نہیں بلکہ اسلاف کی پیروی میں سابقہ کامل و شامل تعلیمی منہج کا احیاء ہی ہے۔

یہ بھی محض خدشہ ہے کہ منہج کی توسیع سے دینی مدارس کا موجودہ نظام کمزور ہو جائے گا۔ ہم دینی مدارس کے موجودہ نظام میں، جس سے مقصود دین کے متنحصص عالم پیدا کرنا ہے، کسی بنیادی تبدیلی کی تجویز نہیں دے رہے بلکہ اس میں ایک خاص نوع کی توسیع کی بات کر رہے ہیں مثلاً یوں سمجھیے کہ اگر اس وقت دینی مدارس بدل پاس طلبہ کو داخلہ دیتے ہیں جو آٹھ سال میں شہادۃ عالمیہ (علوم اسلامیہ و عربیہ میں ایم اے) کرتے ہیں تو اس سسٹم کو علیٰ حالہ باقی رکھا جائے البتہ طلبہ کا ایک اور گروپ ہو جو ثانویہ خاصہ میں دوسرے طلبہ کے ساتھ سارے اسلامی مضامین کے ساتھ وہ اسلامی معاشیات کا مضمون بھی پڑھے۔ پھر عالمیہ میں دو سال لگا کر وہ اسلامی معاشیات پڑھے (مغربی معاشیات کا تقابلی مطالعہ بھی اس کا جزو ہوگا) اور اسلامی معاشیات میں وہ شہادۃ عالمیہ حاصل کرے۔ اسی طرح انگریزی، اردو، قانون، تربیت اساتذہ، ابلاغ عامہ، فلسفہ وغیرہ میں دینی مدارس شہادہ عالمیہ کروا سکتے ہیں اور حکومت سے اپنی سند منظور کروا سکتے ہیں۔ اور حکومت کو یہ سند اصولاً خوشی سے منظور کرنی چاہیے کیونکہ اس کی تو خواہش اور مطالبہ ہی یہ ہے کہ دینی مدارس جدید تعلیم دیں۔

ہم ارباب دینی مدارس کی خدمت میں مزید عرض کرتے ہیں کہ علوم کے تین بڑے شعبے ہیں: ۱۔ دینی علوم ۲۔ سماجی یا عمرانی علوم اور ۳۔ سائنسی علوم۔ علماء کرام اس وقت پہلے شعبے میں کام کر رہے ہیں۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ وہ دوسرے شعبے یعنی سماجی علوم میں سے بھی بعض اہم تخصصات ہاتھ میں لے لیں کیونکہ یہ علوم بھی درحقیقت اسلامی ہی ہیں کیونکہ یہ مسلم شخصیت کی تکوین میں اہم حصہ لیتے ہیں اور مسلم معاشرے کو اسلام کے مطابق چلانے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں مثلاً

اگر علماء کرام اچھے ذہن کے اساتذہ تیار کریں تو وہ سارے پاکستان کی کاپی لٹ سکتے ہیں۔ اگر وہ اسلامی ذہن رکھنے والے میڈیا کے افراد تیار کر دیں تو عوام کے ذہنوں کو اسلام پر عمل کے لیے آسانی سے تیار کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ قانون کے شعبے کو ہاتھ میں لیں تو ایسے بیج اور وکلاء تیار کر سکتے ہیں جو اسلامی فقہ اور جدید قانون میں بیک وقت ماہر ہوں گے۔ وقس علی ذلک۔ اور یہ کوئی نیا کام نہیں بلکہ یہ کام وہ پہلے ہی جزو کر رہے ہیں مثلاً سماجی علوم میں سے لغت، ادب، فلسفہ، منطق، قانون (فقہ) وہ پہلے ہی پڑھا رہے ہیں ہم ان میں چند ایک مضامین کے محض اضافے کی بات کر رہے ہیں اور ان میں تخصص کروانے کی بات کر رہے ہیں۔

صحیح نظام تعلیم کی اہمیت

اس بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم علماء کرام کی خدمت میں عرض کریں گے کہ اگر وہ غور فرمائیں تو وہ بھی ہماری طرح اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ امت زوال کے موجودہ گرداب سے اس وقت تک نہیں کل سکتی جب تک وہ اپنے نظام تعلیم کو صحیح نہیں کر لیتی اور اس کا نظام تعلیم اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے سارے نظام تعلیم کو اسلامی بنیادوں پر استوار نہیں کر لیتی اور مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات نہیں حاصل کر لیتی۔ صحیح اسلامی نظام تعلیم سے ہماری مراد دینی مدارس کا نظام نہیں بلکہ ایک موحد نظام تعلیم ہے جس میں دینی علوم (عصری تقاضوں کے مطابق..... جن کا کچھ ذکر پہلے ہو چکا) کے علاوہ دنیوی علوم کی تعلیم بھی اسلامی تناظر میں اور مغربی فکر کو رد کرتے ہوئے، شامل ہو۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ:

۱۔ دینی علوم کی موجودہ تعلیم میں عصری ضرورتوں کے مطابق ضروری تبدیلیاں لائی جائیں۔

۲۔ سماجی علوم (معاشریات، سیاسیات، قانون، ابلاغ عامہ، فلسفہ، تاریخ وغیرہ) از سر نو اسلامی بنیادوں پر مرتب کیے جائیں۔

۳۔ سائنسی علوم (کیمیا، طبیعیات، حیاتیات، علم الافلاک وغیرہ) اور ٹیکنالوجی کو اسلامی ذہن کے ساتھ فروغ دیا جائے۔

اس کے ساتھ ہی اسلامی تناظر میں اساتذہ کی تدریب اور طلبہ کی تربیت کا انتظام کیا جائے اور تعلیمی اداروں کے

ماحول کو بدلا جائے۔

مندرجہ بالا کام انتہائی مشکل اور وسیع کام ہے اور اس کے لیے وسیع مادی وسائل اور اسلامی ذہن کی بہترین افرادی قوت درکار ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہماری مغرب کی گماشتہ حکومتوں کو یہ کام کرنے کا احساس نہیں تو کیا پرائیویٹ سیکٹر خصوصاً علماء کرام بھی اس کے لیے متحرک نہ ہوں اور وہ ٹھنڈ سے پیٹوں برداشت کرتے رہیں کہ قوم جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتی اور زوال کے گڑھے میں ڈبکیاں کھاتی رہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ بہر حال دینی مدارس کے اہل حل و عقد کو اس کام کے کرنے کا دوسروں سے بڑھ کر احساس ہونا چاہیے اور اگر وہ اس کی اہمیت کا ادراک کر لیں تو یقیناً قوم اس کام کے کرنے میں ان کا ساتھ دے گی۔ ہم کہتے ہیں کہ چلیے وہ اس سارے پراجیکٹ میں ہاتھ نہیں ڈال سکتے تو کم از کم ان چند مضامین کی کتب ہی نئے سرے سے مدون کر لیں جنہیں وہ اپنے طلبہ کو میٹرک، ایف اے اور بی اے میں پڑھانا چاہتے ہیں اور اپنے نظام میں عصری ضرورتوں کے مطابق وہ چند تبدیلیاں ہی کر لیں جن کی طرف سطور بالا میں ان کی توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔ ہذا ما عندنا و العلم عند اللہ

’تحفظ نسواں ایکٹ‘ کتاب وسنت کے تناظر میں

حال ہی میں حکومت پاکستان نے حدود آرڈیننس کے دو قوانین، حدزنا اور حد قذف میں ترمیم کر کے ’تحفظ نسواں بل‘ کے عنوان سے ایک نیا قانون متعارف کروایا۔ اس قانون کو کتاب وسنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے ایک خصوصی علماء کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ بعد میں یہ بل مختلف مراحل طے کرتا ہوا قانون ساز اداروں سے پاس ہو گیا، تاہم اس کے نتیجے میں ملک بھر میں ایک بہت بڑا انزاع پیدا ہو گیا کہ یہ قانون کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہے یا نہیں؟ حدود آرڈیننس کی طرح اس قانون کے بارے میں اختلاف نے بھی سیاسی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ زیر نظر تحریر میں ہم نے کوشش کی ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں اس قانون کا جائزہ لیا جائے، تاہم ہمیں یقین ہے جس طرح پاکستان میں حدود آرڈیننس مکمل طور پر ناکام ہو گیا، زیر بحث قانون بھی اس طرح ناکام رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں اسلامائزیشن آف لاکا بہت چرچا رہا اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے کئی قوانین میں ترمیم کی گئیں اور کئی نئی دفعات متعارف کروائی گئیں، متعدد نئے ادارے وجود میں آئے جس سے یہ سمجھا جانے لگا کہ متعلقہ قوانین کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اسلامیان پاکستان اس انتظار میں رہے کہ اب معاشرہ اسلامی قوانین کے نفاذ کی برکات سے مستفید ہوگا اور ہر طرف امن وعافیت، رفاہیت و خوش حالی اور عدل وانصاف کا دور دورہ ہو جائے گا، لیکن جب معاشرتی زوال کی رفتار میں کمی آنے کے بجائے اسلامی اور انسانی اقدار کی پامالی کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں تو اسلامی قوانین کی اثر آفرینی کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہونے شروع ہوئے جو آگے چل کر ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئے۔ اس صورت حال کے حقیقی اسباب کا کھوج لگانے کے بجائے اسلام کے نام پر نافذ کیے گئے قوانین، بالخصوص حدود آرڈیننس اور قانون شہادت وغیرہ کے حامیوں اور مخالفوں کے متحارب کیمپ معرض وجود میں آگئے اور دو طرفہ زور آزمائی شروع ہو گئی۔

امرواقعہ یہ ہے کہ جس سیاق میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہوا تھا، اس سے اسلام کی بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا اور آئندہ بھی اس طرح اسلامی قوانین کے نفاذ کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی قوانین پورے اسلامی نظام کے وجود کا ایک حصہ ہیں اور اپنا الگ فلسفہ، اساسیات، اصول اور منہاج رکھتے ہیں۔ ان کی اثر آفرینی کے لیے ضروری ہے کہ انہیں پورے اسلامی نظام کی تمام اساسیات، منہاج اور اصول کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ دوسری طرف اینگلو

☆ سابق ڈین فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز، AIU، اسلام آباد۔

سیکسن لاجو پاکستان کو وراثت میں ملا ہے، اپنا الگ فلسفہ، اصول اور مبادی رکھتا ہے۔ چونکہ دونوں قسم کے قوانین کا بلڈ گروپ الگ الگ ہے، اس لیے ان میں باہم پیوند کاری ممکن نہیں اور اگر زبردستی پیوند کاری کی کوشش کی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوتا ہے جو حدود آرڈیننس وغیرہ کے بارے میں نکلا۔ اسلامی قوانین کا شجرہ طیبہ اینگلو سیکسن لاک کی سرزمین پر کبھی بار آور نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر اسلامی قوانین کی اساس عدل ہے، جبکہ اینگلو سیکسن لاک کی ”قانون کی بالادستی“ ہے۔ اس کی وضاحت مرحوم جسٹس گل محمد، سابق چیف جسٹس فیڈرل شریعت کورٹ اس طرح کرتے تھے کہ اگر بالفرض یورپ کے کسی ملک کی پارلیمنٹ یہ قانون بنا دے کہ جس کسی کا قد چھ فٹ سے زائد ہو، اسے سزائے موت دے دی جائے تو اسلام ایسی قانون سازی کو تسلیم نہیں کرتا، جبکہ قانون کی بالادستی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے بہر طور نافذ کر دیا جائے۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بے شمار ایسے قوانین ہیں جو عدل کے سراسر خلاف ہیں، لیکن دنیا بھر کی عدالتیں انہیں کے مطابق فیصلے کرتی ہیں۔ ویڈیو کے اختیارات اس کی بدترین مثال ہے۔

پاکستان میں خواتین کے حقوق کے حوالے سے یہ فرق بہت نمایاں ہو جاتا ہے کہ اسلام مرد کو انتظامی برتری (النساء ۳۴:۴) اور عورت کو احترامی برتری (النور ۲۴:۴) کے اعزاز سے نوازتے ہوئے ہر ایک کو اپنے اپنے دائرہ کار میں دوسرے پر فوقیت دیتا ہے، لیکن اینگلو سیکسن لامردوزن کی ہمہ وجہ مساوات کا قائل ہے۔ اس لیے اینگلو سیکسن لاک کے حوالے سے عورت کی گواہی اور دوسرے کئی قوانین پر خواتین کا اعتراض بجا ہے۔ اگر یہ قوانین مکمل اسلامی نظام کے تناظر میں نافذ کیے جاتے تو اسلام کا نقطہ نظر یہ سامنے آتا ہے کہ عورت نہ صرف ثقہ، سچی، امانت دار اور قابل اعتماد ہوتی ہے بلکہ اس قدر دانش مند اور سمجھ دار بھی کہ ان میں کسی کم فہم اور دینی اعتبار سے کمزور عورت میں بھی قدرت نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ دانش مند سے دانش مند مرد کو باسانی متاثر کر لیتی ہے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر ۳۰۴، تشریح از حکیم الاسلام قاری محمد طیب، خطبہ ”فضیلت النساء“) البتہ اس کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اسے عدالتوں اور کچھ ریوں میں نخل خوار ہونے سے بچایا جائے۔ (ہدایہ، کتاب الشہادۃ، ۳: ۱۱۵) اس پس منظر میں کیا کسی مسلمان خاتون کو اس پر اعتراض ہوگا کہ اسے ناشائستہ مقدمات میں گواہی سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے؟ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہر مسلمان خاتون کا سر فخر سے بلند ہوگا کہ اسلامی معاشرے میں اس کی عزت و احترام مرد سے کہیں بڑھ کر ہے۔ لیکن جب ہم اینگلو سیکسن لاک کے جسم میں اسلامی قانون کا کوئی عضو لگانا چاہتے ہیں تو وہ اسے قبول کرنے سے ابا کر دیتا ہے اور اس کا الزام اسلام کی نتیجہ خیزی پر آتا ہے۔ طالبان کے افغانستان اور سعودی عرب میں اسلامی قوانین کی کامیابی اور اثر آفرینی کی وجہ صرف اور صرف یہ رہی کہ ان دونوں ممالک میں اسلامی قوانین کی پیوند کاری نہیں کی گئی بلکہ وہ اسلام جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور قرن بہ قرن اس میں اجتہاد کے ذریعے ارتقا جاری رہا، اسے ہتمام و کمال نافذ کرنے کی سعی کی گئی جس کی بنا پر اس کی اثر آفرینی سے دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے۔

تحفظ نسواں بل کا جائزہ لینے کے لیے علما کی جو خصوصی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی، اس کی رپورٹ کمیٹی کے ایک ممبر مولانا زاہد الراشدی نے ماہنامہ ”الشریعہ“ اکتوبر ۲۰۰۶ء میں شائع کی جس سے معلوم ہوا کہ علمائے کرام نے حد زنا اور حد زانیہ کی بیالیس دفعات کی مجوزہ چوالیس ترامیم میں سے صرف تین کے بارے اختلاف رائے کا اظہار کیا۔ ☆ بعد کے ایک زیادہ

☆ یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ اس رپورٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ تین دفعات کے بارے میں علما کمیٹی اور چودھری شجاعت حسین

منضبط جائزے میں جو کمیٹی کے ایک دوسرے رکن مولانا محمد تقی عثمانی کے قلم سے روزنامہ جنگ اور نوائے وقت میں قسط وار شائع ہوا اور جسے بعد میں الشریعہ نے بھی شائع کیا، اس بل پر چھ اہم اعتراضات کیے گئے جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ ایک اسلامی ریاست میں قرآن و سنت کی بالادستی قرآن کی قطعی نصوص سے ثابت ہے۔ جب ایک مرتبہ زنا کی حد کا فیصلہ ہو جائے تو حکومت کو اس کی معافی یا تخفیف کا اختیار نہیں ہے۔ زیر نظر بل میں زنا آرڈیننس کی دفعہ ۲۰ شق (۵) کو حذف کر کے حکومت کو سزا میں تخفیف کا جو اختیار دیا گیا ہے، وہ قرآن و سنت کے خلاف ہے۔

۲۔ زنا بالجبر، زنا کی ایک قسم ہے، اسے حدود سے نکال کر تعزیرات میں شامل کرنا کتاب و سنت کے خلاف ہے۔

۳۔ زنا بالرضا موجب حد اور فحاشی کو ناقابل دست اندازی پولیس قرار دے کر ان جرائم کو تحفظ دیا گیا ہے۔ اسلامی احکام کے تحت فحاشی کا جرم معاشرے اور ریاست کے خلاف جرم ہے۔ اس کا ثبوت اس قدر دشوار بنا دیا گیا ہے کہ اس کے تحت کسی کو سزا نہیں ہو سکتی۔

۴۔ حدود آرڈیننس میں اگر حد زنا کے لیے مطلوبہ ثبوت موجود نہ ہوتا لیکن انغوا یا عصمت دری کا جرم ثابت ہو جاتا تو حد زنا دفعہ ۱۰ کے تحت تعزیری سزا دی جاسکتی تھی، اب کوئی سزا نہیں دی جاسکتی کیونکہ زیر نظر بل نے عدالت سے یہ اختیار واپس لے لیا ہے۔ گویا فحاشی کو تحفظ دیا گیا ہے۔

۵۔ قذف میں ترمیم کر کے مرد کو یہ چھوٹ دے دی گئی ہے کہ وہ چاہے تو عورت کے مطالبے کے باوجود لعان کی کارروائی میں شرکت سے انکار کر دے۔ یہ ترمیم قرآن حکیم کے منافی ہے۔

۶۔ قذف آرڈیننس میں یہ ترمیم بھی کتاب و سنت کے منافی ہے کہ عورت کے رضا کارانہ اقرار جرم کے باوجود اسے سزا نہیں دی جائے گی۔

علمائے کمیٹی کے ان چھ اختلافی نکات کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی پیش کردہ باقی ترامیم سے علمائے کرام متفق ہیں جو بجائے خود ایک خوش آئند بات ہے، البتہ پچھلے سا لہا سال سے بالعموم اور پچھلے کچھ عرصے سے بالخصوص پاکستان کی مذہبی سیاسی جماعتیں اور متعدد دینی شخصیات جس تسلسل سے حدود آرڈیننس کو خدائی قانون اور ناقابل ترمیم قرار دیتی رہیں اور اس کے بعد جب مکالمے کا موقع آیا تو اپنے سابقہ موقف سے دست کش ہو کر جس طرح ترامیم کے لیے آمادہ ہو گئیں، اس پر بسوخت عقل زحیرت کہیں چہ بولاجی ست۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ علمائے کرام کی طرف سے اس نوعیت کی Sweeping statements کی وجہ سے عوام اور دینی جذبات رکھنے والے نیک دل مسلمانوں کے حسن ظن کو، جو روایتی علما پر بے پناہ اعتماد کرتے ہیں، ٹھیس پہنچتی ہے۔ مذہبی سیاسی جماعتوں کے قائدین اور دیگر دینی شخصیات سے ہماری عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ دینی مسائل پر غور و فکر اور تبصرہ کرتے ہوئے آخرت کی جواب دہی کو ملحوظ رکھا کریں اور دینی مسائل پر گروہی، فرقی اور امتحابی سیاست کی آلودگیوں سے اپنا دامن بچا کر رکھیں تو اس سے جہاں علما کے وقار پر آنچ نہیں آئے گی، وہاں ان پر اعتبار اور اعتماد کی روایت بھی متاثر نہیں ہوگی۔ ذاتی طور پر ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ علمائے کرام

صاحب اور ان کے رفقاء کے درمیان اتفاق ہوا ہے، جبکہ دوسری بہت سی دفعات کے بارے میں بھی علماء کرام نے متعلقہ رپورٹ میں اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے اور ان کے حوالے سے اپنی رائے الگ پیش کی ہے۔ (راشدی)

نے حدود آ آر ڈیننس کو اس کے اصل تناظر میں دیکھنا شروع کر دیا ہے اور اب حدود آ آر ڈیننس نہیں بلکہ حدود اللہ الہامی قوانین قرار پائی ہیں۔

علمائے کرام کی خصوصی کمیٹی نے اپنی چھ اضافی سفارشات میں خواتین کو وراثت سے عملاً محروم رکھنے، زبردستی نکاح کر دینے، بیک وقت تین طلاقیں دینے، قرآن سے نکاح، وٹہ سٹہ اور عورتوں کی خرید و فروخت کے مذموم رسوم و رواج کے سد باب کے لیے قانون سازی کی سفارش کی۔ اگر زیر نظر بل واقعتاً ”تحفظ نسواں بل“ ہوتا، حکومت اور ملک بھر میں پھیلی ہوئی این جی اوز واقعتاً خواتین کے حقوق کے تحفظ میں مخلص ہوتیں تو ہمارے خیال میں ان تمام سفارشات کو بل کا حصہ بنا کر فوراً نافذ کر دیا جاتا کیونکہ ان میں سے کوئی بھی سفارش ایسی نہیں جن کے بارے میں کسی اختلاف کی گنجائش ہو، لیکن اس سلسلے میں حکومتی حلقوں اور این جی اوز کی طرف سے کسی سرگرمی کا مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ NGOs کا معاملہ تو قابل فہم ہے کہ اگر خواتین کے نوے فیصد مسائل حل ہو جاتے ہیں تو این جی اوز چلانے کے لیے مسائل کہاں سے آئیں گے اور کس بنا پر بیرونی فنڈز حاصل کرنے کی راہیں وارکھی جائیں گی، لیکن اس سلسلے میں حکومت کی سرمدہری ناقابل فہم ہے۔ اگر حکومت واقعتاً بے حیائی اور فحاشی کو تحفظ دینے کے بجائے خواتین کے حقیقی مسائل حل کرنے میں مخلص ہوتی تو اسے اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔

علمائے کمیٹی نے اگرچہ دیدہ ریزی سے زیر نظر بل کا جائزہ لے کر ان دفعات کی نشاندہی کی ہے جو ان کے خیال میں کتاب وسنت کے متصادم ہیں، لیکن ہمارے خیال میں زیر بحث بل میں مزید کئی ایسی دفعات ہیں جو صراحتاً قرآن وسنت کے خلاف ہیں۔ ذیل میں ان کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔

۱۔ حدود آ آر ڈیننس میں حد زنا، دفعہ ۴ میں زنا کی تعریف یوں کی گئی تھی:

A man and a woman are said to commit Zina if they willfully have sexual intercourse without being validly married to each other.

”کسی مرد اور عورت کو زنا کا مرتکب کہا جائے گا، اگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ نکاح صحیح میں ہوئے بغیر جماع کریں۔“

اس تعریف کی وجہ سے خواتین کے لیے یہ دقت پیدا ہو گئی تھی کہ وہی علاقوں میں نکاح اور طلاق کو رجسٹرڈ نہیں کروایا جاتا اور زبانی طلاق کے بعد نکاح کرنے والی خاتون کو اس کا سابقہ شوہر حدود آ آر ڈیننس کی مذکورہ بالا دفعہ کی آڑ میں ظلم و ستم کا نشانہ بناتا تھا۔ اس لیے مذکورہ بالا دفعہ سے validly (صحیح) کے الفاظ خارج کر دیے گئے جس کا مطلب یہ ہے کہ مرد اور عورت کا نکاح صحیح ہو یا فاسد یا باطل، بہر طور ان کا جنسی تعلق زنا قرار نہیں پائے گا اور مذکورہ بالا قسم کی خاتون کو ظلم سے بچا یا جاسکے گا۔

یہ وجہ اگرچہ درست ہے، لیکن اس کے لیے تبدیلی مسلم فیملی لاز میں کرنے کی ضرورت تھی تاکہ زبانی طلاق کو بھی طلاق سمجھا جائے۔ حد زنا آ آر ڈیننس میں مذکورہ تبدیلی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زنا کے الزام میں ماخوذ جوڑے کے مقدمے کی باگ ڈور اس عورت کے ہاتھ میں آ جاتی ہے جو شریک جرم ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر چار چشم دید گواہوں کے باوجود عورت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ شریک مرد کے ساتھ اس نے نکاح کیا ہے تو خواہ وہ کسی دوسرے کی منکوحہ ہو، نئے نکاح کا کوئی گواہ ہو نہ کوئی

ثبوت، محض نکاح کا دعویٰ ہی اسے سزا سے بچانے کے لیے کافی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ یہ نکاح باطل قرار پائے گا جس کی بنا پر دونوں شریک مجرموں کو شک کا فائدہ ملے گا اور زیر نظر بل کی دفعہ ۵ (اے) کے تحت عدالت اس جوڑے کو فاشی وغیرہ پر تعزیری سزا بھی نہیں دے سکے گی۔ اور اگر خاتون شریک جرم مرد کو سزا دلوانا چاہتی ہو تو وہ عصمت درمی کا الزام عائد کر کے خود بخفی سکتی ہے اور مرد کو سزا دلوا سکتی ہے۔ خاتون کو صرف اس صورت میں سزا ملنے کا امکان ہے جب وہ اپنے دفاع میں کچھ نہ کہے اور گواہوں کی گواہی کو بے چون و چرا تسلیم کر لے جس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام میں سے کسی نے بھی زنا موجب حد کی وہ تعریف نہیں کی جو حدود آرڈیننس میں تھی یا جو زیر بحث بل میں ہے، بلکہ علامہ کاسانی نے تمام امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے زنا موجب حد کی ایک جامع و مانع تعریف کی ہے جو یہ ہے:

”زنا اس حرام جماع کو کہتے ہیں جو کسی زندہ، قابل ثبوت عورت کی اگلی شرم گاہ میں اسلامی ریاست میں ایسے شخص سے اپنے قصد اور اختیار سے واقع ہوا ہو جس نے اسلام کے احکام اپنے ذمے لازم کر لیے ہوں۔ یہ جماع حقیقت ملک، حقیقت نکاح، شبہ ملک اور شبہ نکاح سے خالی ہو اور جس موقع پر ملک یا نکاح کا شبہ ہو سکتا ہو، وہ شبہ اشتباہ سے بھی خالی ہو۔“
(بدائع الصنائع، ۷/۳۳۳)

۲۔ عصمت درمی سے متعلق دفعات کو حدود آرڈیننس سے نکال کر مجموعہ تعزیرات پاکستان میں دفعہ ۵، ۳۷، ۳۷ کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ دفعہ ۵، ۳۷ میں عصمت درمی کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

”کسی مرد کو عصمت درمی کا مرتکب کہا جائے گا جب وہ کسی عورت کے ساتھ مندرجہ ذیل پانچ حالات میں سے کسی حالت میں جماع کرے:

۱۔ اس کی مرضی کے خلاف۔

۲۔ اس کی رضامندی کے بغیر۔

۳۔ اس کی رضامندی سے جب کہ رضامندی اس کو ہلاک یا ضرر کا خوف دلا کر حاصل کی گئی ہو۔

۴۔ اس کی مرضی سے جب کہ مرد جاننا ہو کہ وہ اس کے نکاح میں نہیں ہے اور عورت نے رضامندی کا اظہار اس وجہ سے کیا ہو کہ عورت یہ باور کرتی ہے کہ اس مرد کے ساتھ اس کا نکاح ہوا ہے۔

۵۔ عورت کی رضامندی سے یا اس کی رضامندی کے بغیر جب کہ وہ سولہ سال سے کم عمر کی ہو۔“

اس دفعہ کے بارے میں علما کمیٹی کا اعتراض یہ ہے کہ اسے حدود میں شامل کیا جانا چاہیے تاکہ اس میں حکومت کو سزا کا اختیار نہ رہے۔ گویا علما کمیٹی کے نزدیک یہ دفعہ درست ہے، البتہ اس کا مقام تبدیل کر کے اسے مجموعہ تعزیرات پاکستان کے بجائے حدود آرڈیننس میں رکھا جائے، جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ دفعہ اپنے متن اور نتائج کے اعتبار سے قرآن و سنت کے اساسی عائلی نظام سے متصادم ہے، مگر اس کا تذکرہ کہیں سننے میں نہیں آیا۔

یورپ اور امریکہ کے قوانین کی رو سے کوئی شوہر اپنی بیوی کی مرضی کے خلاف یا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے اپنی جنسی خواہش پوری کرتا ہے تو بیوی، شوہر کے خلاف عصمت درمی کا مقدمہ کر کے اسے سزا دلوا سکتی ہے۔ اسلام میں میاں بیوی کے تعلقات میں عصمت درمی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اگرچہ قرآن کی رو سے میاں بیوی میں مودت و محبت کا رشتہ

ہوتا ہے (الروم ۳۰: ۲۱)، انہیں ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا خیال رکھنا چاہیے (النساء ۴: ۲۹) لیکن قرآن کے حوالے سے میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ (البقرہ ۲: ۱۸۷) مخصوص ایام کے علاوہ شوہر پر اپنی بیوی سے مقاربت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ (البقرہ ۲: ۲۲۲) جن ایام میں پابندی ہے، اس کا تعلق بھی فوجداری قوانین سے نہیں ہے۔ جب کہ زیر بحث دفعہ میں مرد اور عورت کا اطلاق میاں بیوی پر بھی ہوتا ہے اور اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ کوئی شوہر اپنی بیوی کی رضامندی کے بغیر اپنی خواہش کی تکمیل نہیں کر سکے گا۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے یا بیوی کسی وجہ سے شوہر کو سزا دلوانا چاہتی ہے تو بہت آسانی سے شوہر کی خواہش کی تکمیل کے بعد اس کے خلاف عصمت دری کے ثبوت عدالت میں پیش کر کے اسے سزائے موت یا دس سے پچیس سال کی سزائے قید دلا سکتی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ مرد کے لیے فطری خواہش کی تکمیل کے جائز ذرائع پر پابندی عائد کر دی گئی ہے، البتہ ناجائز ذرائع سے خواہش کی تکمیل کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر شوہر پر مقدمہ کرنے کے بعد بیوی اپنے کیے پر پشیمان ہو کر یہ اعتراف کرتی ہے کہ اس نے غلط مقدمہ قائم کیا تھا تو اس کا کوئی مدعا و زیر نظر بل میں دریافت نہیں ہو سکا، کیوں کہ عصمت دری کا مقدمہ ناقابل ضمانت اور ناقابل مصالحت ہے۔ نیز اس دفعہ کے مطابق سولہ سال سے کم عمر لڑکی کے ساتھ جنسی عمل بہر طور عصمت دری ہے، خواہ اس کی رضامندی سے ہو، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کی بیوی سولہ سال سے کم عمر کی ہے تو وہ جوڑا اپنی جائز خواہشات کی تکمیل بھی نہیں کر سکتا۔ اگرچہ نکاح کے مقاصد کے حوالے سے یہ ضروری ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے بالغ ہونے کے بعد ان کا نکاح کیا جائے لیکن ایک تو یہ کہ بلوغ کا تعلق جسمانی تبدیلیوں اور تخلیقی صلاحیت کے آغاز سے ہے نہ کہ سولہ سال کی عمر سے۔ دوسرے یہ کہ بعض حالات میں والدین کی مجبوری بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو سولہ سال پورے ہونے سے پہلے کسی کی حفاظت میں دے دیں۔ مثلاً ایک شخص کینسر کا مریض ہے اور اسے معلوم ہے کہ وہ سال بھر زندہ نہیں رہے گا، وہ اپنی پندرہ سالہ لڑکی کا واحد نگران ہے، کیا یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو معاشرے کے درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے مرنے سے پہلے کسی مناسب مرد سے اس کا نکاح کر دے؟ لیکن موجودہ قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔

اس دفعہ میں ایک پہلو ایسا ہے جس کے تذکرے بلکہ تصور سے ہی ایک مسلمان کے دل و دماغ کرچی کرچی ہو کر بکھر جاتے ہیں۔ اکثر مولفین حدیث اور سیرت نگاروں کے مطابق سیدہ عائشہؓ کی رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ کیا یہ قانون بنانے والوں نے غور نہیں کیا کہ اس دفعہ کی رو سے انہوں نے اپنے مرکز ایمانی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں لاکھڑا کیا ہے؟ کیا اس کے بعد میدان حشر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ حسنگمین کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں یا آپ کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے؟ کیا عرصہ محشر میں سیدہ عائشہؓ گریباں گیر نہیں ہوں گی؟ اتنی بڑی جسارت کے بعد اگر آسمان گر پڑے، زمین کا جگر شق ہو جائے اور فضا سے وہ آگ برسن شروع ہو جائے جو پوری انسانی تاریخ میں انبیاء کرام کی توہین پر برسی ہے تو کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

حدود آرڈیننس، حدزنا کی دفعہ ۶(ا) کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

”کسی شخص کو عصمت دری کا مرتکب کہا جائے گا اگر وہ مرد یا وہ عورت کسی ایسی عورت یا مرد سے جیسی بھی صورت ہو، جس کے ساتھ وہ مرد یا وہ عورت نکاح صحیح میں نہ ہو، مندرجہ ذیل حالات میں سے کسی میں جماع کرے.....“

اس دفعہ کی رو سے نکاح کی صورت میں عصمت درمی کا مقدمہ قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ اب اس میں سے نکاح کی قید یا شرط نکال دی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ قرآن و سنت کی قطعی نصوص سے متصادم ہو گئی ہے۔

علمائے کرام نے اس دفعہ پر صرف یہ اعتراض کیا ہے کہ عصمت درمی زنا کی قسم ہے، اس لیے موجب حد جرم ہے، اسے تعزیر میں رکھنا درست نہیں، البتہ اس میں یہ دقت پیش آتی ہے کہ زنا کے ثبوت کے لیے کتاب و سنت کی رو سے چار مسلمان عادل چشم دید گواہ ہونے ضروری ہیں جن کی عدم موجودگی مظلوم خواتین کے لیے گونا گوں مشکلات کا باعث بنتی رہی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ”کوئی ایک مقدمہ بھی ایسا نہیں جس میں زنا بالجبر کی کسی مظلومہ کو اس بنا پر سزا دی گئی ہو کہ وہ چار گواہ نہیں پیش کر سکی بلکہ اگر عورت کا کردار مشکوک ہو، تب بھی عورتوں کو سزا نہیں ہوتی۔ عورت کو شک کا فائدہ دے کر چھوڑ دیا جاتا ہے، لیکن کیا مظلومہ کو انصاف ملتا ہے اور اس کی دادی ہوتی ہے؟ درحقیقت ججوں کے اور رسول سوسائٹی کے معیار انصاف میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جب کوئی جج کسی ایسے ملزم کو جو آٹھ دس سال جیل میں گزار چکا ہو، باعزت بری کرتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نے مظلوم کی دادی کر دی اور حق و انصاف کا بول بالا ہو گیا، لیکن باعزت بری ہونے والے شخص اور رسول سوسائٹی کا نقطہ نظر بالکل مختلف ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ اس شخص کے زندگی کے آٹھ دس سال چھین لینے کا کون ذمہ دار ہے؟ اس کی عزت اور نیک نامی کو جو دھبہ لگ گیا ہے، وہ کیسے دھل سکتا ہے؟ اس کی زندگی بھر کا اثاثہ مقدمات کی نذر ہو گیا، وہ اسے کیسے واپس مل سکتا ہے؟ اس کا گھر، خاندان تباہ ہو گیا، بچے در بدر ہو گئے اور وہ باعزت ہونے کے باوجود اپنے گھر، خاندان اور سماج میں ذلیل ہو گیا۔ اس انصاف کے بجائے اگر اسے بے گناہ ہونے کے باوجود سنگسار کر دیا جاتا تو وہ اس ذلت کی زندگی سے توجہت پال سکتا تھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں جتنے ظلم عدالتوں کے کٹھنوں میں انصاف کے نام پر ہوتے ہیں، اتنے عالمی جنگوں میں بھی نہیں ہوئے۔ انصاف فراہم کرنے والوں کو اگر کبھی خود حصول انصاف کے مراحل سے سابقہ پڑے تو شاید انہیں محسوس ہو کہ بڑے بڑے ائمہ، قاضی بننے کے بجائے جیلوں میں مرنے کو کیوں ترجیح دیتے تھے۔

الغرض عصمت درمی کو زنا کی قسم قرار دینے کے لیے جو دلائل دیے گئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ قرآن حکیم کی سورہ نوری آیت نمبر ۲ میں زنا کی حد بیان کی گئی۔ اس آیت میں زنا کا لفظ مطلق ہے جو ہر قسم کے زنا کو شامل ہے۔ اس میں زنا مندی سے کیا ہوا زنا بھی داخل ہے اور زبردستی کیا ہوا زنا بھی۔

۲۔ ترمذی کی حدیث نمبر ۱۴۵۴ کے مطابق مدینہ منورہ میں نماز کو جانے والی ایک عورت کی عصمت درمی کی گئی۔ عورت نے شور مچایا تو وہ شخص بھاگ گیا۔ بعد میں اس نے اعتراف کر لیا اور رسول اللہ ﷺ نے اسے رجم کروا دیا۔

آئیے، اب ان دلائل کا جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ پہلی دلیل کا تعلق اصول فقہ سے ہے کہ زنا کا لفظ مطلق ہے اور اس میں رضامندی اور جبر دونوں قسم کے زنا شامل ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ زنا کا لفظ مطلق نہیں، بلکہ یہ ایک اصطلاح ہے اور اصطلاحات کبھی مطلق نہیں ہوتیں۔ یہ لفظ خاص ہے اور اس کا مفہوم متعین ہے جس میں دو طرفہ آزادانہ رضامندی کا عنصر ضروری ہے، جیسا کہ اکاسانی نے الہدایۃ: ۳۳۷ میں اور ابو عبد اللہ قرطبی نے الجامع الاحکام القرآن ۱۵۹:۱۲ میں اس کی تصریح کی ہے۔ اس سے عصمت درمی مراد لینا اس لیے بھی غلط ہے کہ بالعموم مفسرین نے سورہ نوری کی مذکورہ بالا آیت کے بارے میں کہا ہے کہ اس میں سورہ النساء کی آیت ۱۵ میں کیے گئے

وعدے کی تکمیل ہے۔ گویا قانونی الفاظ میں سورۃ النور کی آیت ۲ کو سورہ النساء کی آیت ۱۵ کے ساتھ ملا کر پڑھیں گے جو یہ ہے:

وَاللَّاتِي يَأْتِيَنَّ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَائِكُمْ فَاسْتَشْهَدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِنْكُمْ فَإِنْ شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّى يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا

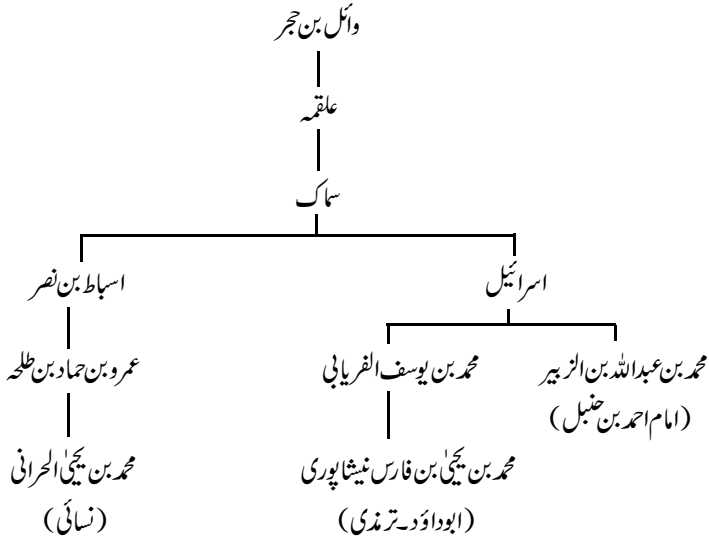
”تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا ارتکاب کرے تو اس پر اپنے میں سے چار گواہ لاؤ۔ اگر وہ گواہی دے دیں تو انہیں گھروں میں بند کر دونا آنگہ وہ فوت ہو جائیں یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکالے۔“

اس آیت میں ان عورتوں کا ذکر ہے جو بدکاری کا ارتکاب کرتی ہیں، نہ کہ ان خواتین کا جو بدکاری کا شکار ہوتی ہیں، لہذا سورہ نور میں وہی خواتین مراد ہوں گی جو اپنی رضامندی سے جرم زنا کا ارتکاب کرتی ہیں۔

قرآن حکیم نے جہاں خواتین کے ساتھ جبر اور زبردستی کا ذکر کیا ہے وہاں ”زنا“ کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ وہاں بغاء (بغی) پر اکراہ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ سورہ النور میں ہے: وَلَا تُكْرَهُوا فَتِيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ (۳۳:۲۴) (اپنی باندیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو) اگر مجبوری کی حالت میں کسی مرد کے سامنے بے بس ہو جانا اور اسے اپنے اوپر اختیار دے دینا ”زنا“ ہوتا تو آیت کے الفاظ یوں ہوتے: وَلَا تُكْرَهُوا فَتِيَاتِكُمْ عَلَى الزَّانَا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عصمت دری قرآن کی اصطلاح میں زنا نہیں، بلکہ نفی ہے جس کی سزا سورہ المائدہ کی آیت ۳۳ میں مذکور ہے۔

۲۔ جس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عصمت دری کے مرتکب شخص کو بھی سنگساری کی سزا دی، اس لیے عصمت دری بھی زنا کی قسم ہے، یہ استدلال بھی درست نہیں ہے۔ اب تک کی جستجو کے مطابق یہ حدیث، چار مستند کتابوں میں آئی ہے: مسند احمد بن حنبل (۶: ۳۹۹)، نسائی، سنن کبریٰ (۴: ۳۱۴)، ابوداؤد، حدیث نمبر ۴۳۷۹ اور ترمذی، حدیث نمبر ۱۴۵۴۔

اس حدیث کا سلسلہ سند یوں ہے:



پوری حدیث یوں ہے:

”عہد نبوی میں ایک عورت نماز پڑھنے گھر سے نکلی، راستے میں ایک شخص نے زبردستی اس سے اپنی خواہش پوری کی۔ عورت چیخی چلائی، اتنے میں ایک شخص وہاں سے گزرا، اس نے عورت کا ماجرا سن کر مجرم کا تعاقب کیا۔ پھر مہاجرین کی ایک جماعت وہاں سے گزری تو وہ بھی واقعہ سن کر مجرم کے پیچھے بھاگے اور انہوں نے پہلے تعاقب کرنے والے شخص کو پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیا۔ عورت نے بھی تصدیق کی کہ یہی مجرم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے کہا، یہ نہیں بلکہ اصل مجرم میں ہوں۔ آپ نے عورت کو گھر بھیج دیا۔ پہلے پکڑے جانے والے شخص کی دل جوئی کی۔“

اصل مجرم کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ اس کے بارے میں ترمذی اور ابوداؤد میں ہے کہ اسے رجم کر دیا گیا اور مسند احمد بن حنبل اور سنن کبریٰ میں ہے کہ آپ نے اسے چھوڑ دیا اور فرمایا کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر تمام اہل مدینہ ایسی توبہ کریں تو سب کے لیے کافی ہو جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل فیصلہ کیا تھا؟ یہ جاننے کے لیے اس حدیث کی سند پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تین درجوں میں اس حدیث کا ایک ایک راوی ہے اور وہ ہیں وائل بن حجر، علقمہ اور سماک۔ چوتھے درجے میں اس کے دو راوی ہیں، ایک اسرائیل اور دوسرے اسباط بن نصر۔ اسباط بن نصر کی روایت نسائی کی سنن کبریٰ میں ہے جس کے متن میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصمت دری کا اعتراف کرنے والے کو سزا نہیں دی، بلکہ اس کی توبہ قبول کر لی گئی۔ اسرائیل کی جو روایت مسند احمد بن حنبل میں ہے، وہ نسائی کے مطابق ہے اور جو ترمذی میں ہے، وہ یہ ہے کہ اعتراف جرم کرنے والے کو رجم کی سزا دی گئی۔ ابوداؤد کا جو نسخہ ہمارے ہاں متداول ہے، اس کی روایت مسند احمد اور سنن نسائی کے مطابق ہے۔ اس لیے روایت کے داخلی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عصمت دری کے جرم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حراہ قرار دیتے ہوئے گرفتاری سے قبل توبہ کرنے والے کو سورہ المائدہ کی آیت ۳۴ کے تحت معافی دے دی تھی۔ درایت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس حدیث کے اس متن کو درست تسلیم کیا جائے جس میں توبہ اور معافی کا ذکر ہے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے جن افراد کو رجم کروایا، ان کے نام یا آثار و احوال بکثرت روایات میں موجود ہیں جب کہ مذکورہ بالا شخص اس فہرست میں شامل نہیں ہے۔ اگر اسے رجم کروایا گیا ہوتا تو مسلمانوں کا ایک جم غفیر اس کارروائی میں شریک ہوا ہوتا اور دوسرے واقعات کی طرح اسے بھی روایت کرتا اور یہ حدیث اپنی سند اور متن دونوں حوالوں سے تو اترا یا کم از کم شہرت کے درجے کو پہنچ گئی ہوتی۔

مزید برآں عصمت دری پر رجم کی سزا کو اس حدیث سے ثابت کرنا ممکن نہیں، کیونکہ یہ خبر واحد ہے اور عصمت دری کی حد کسی قطعی الثبوت و قطعی الدلالت نص سے ہی ثابت ہو سکتی ہے۔

روایات کے تعارض کے باوجود ان تمام روایات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں کہ:

۱۔ جس شخص کو مظلوم خاتون نے بطور مجرم شناخت کیا تھا، وہ اگرچہ بے گناہ تھا لیکن اتفاقی شواہد کی بنا پر اسے سزائے رجم کا حکم سنایا گیا اور یہ تحقیق نہیں کی گئی کہ وہ مجسم ہے یا غیر مجسم۔

۲۔ جب اس مجلس میں اصل مجرم نے اعتراف جرم کیا تو اس کے بارے میں بھی تحقیق نہیں کی گئی کہ وہ مہسن ہے یا غیر مہسن۔ اگر یہ روایت درست ہے کہ اس کے بارے میں رجم کا فیصلہ کیا گیا تو اس کے مہسن ہونے کی تحقیق کے بغیر کیا گیا اور اگر مسند احمد اور نسائی کی روایت، جسے حافظ ابن القیم نے ترجیح دی ہے، درست ہے تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عصمت دری کو حرام قرار دیا اور جب ایک شخص نے خود اعتراف کر کے اپنے آپ کو عدالت کے رو برو پیش کر دیا تو آپ نے آیت حرامہ (المائدہ ۵: ۳۴) کے تحت اس کی سزا معاف کر دی۔

نیز عقل عام کا تقاضا یہ ہے کہ عصمت دری، زنا بالرضا سے زیادہ سنگین جرم ہے، اس لیے اس پر وہی سزا دینا جو زنا بالرضا پر ہے، قرین انصاف نہیں بلکہ جس طرح ڈاکے کی سزا چوری سے زیادہ سنگین ہے، عصمت دری کی سزا زنا بالرضا سے زیادہ سنگین ہونی چاہیے۔ قاضی ابوبکر ابن العربی (احکام القرآن ۲: ۹۵) نے ان فقہاء اور قاضیوں کی عقل کا ماتم کیا ہے جو ڈاکے کو تو حرام قرار دیتے ہیں، لیکن عصمت دری کو حرام قرار نہیں دیتے۔ وہ لکھتے ہیں:

”میرے ایام قضا میں ایک قافلے پر کچھ لوگوں نے حملہ کیا اور ایک عورت کو زبردستی اٹھا کر لے گئے۔ جب وہ پکڑے گئے اور مقدمہ میری عدالت میں پیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے جن مفتیوں کی آزمائش میں مجھے مبتلا کر دیا تھا، میں نے ان سے رائے لی تو وہ کہنے لگے، چونکہ مال نہیں لوٹا گیا، اس لیے یہ حرام نہیں ہے، عصمت دری میں حرام نہیں ہوتا۔ میں نے کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون، کیا تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ عصمت دری کا حرام ہونا ڈاکے سے زیادہ سنگین ہے۔ لوگ اپنے سامنے اپنا مال تو لٹتا دیکھ سکتے ہیں، لیکن اپنی بیوی یا بیٹی کی عزت پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ اگر اللہ کی مقرر کردہ سزا سے زیادہ سزا دی جاسکتی تو عصمت کے ان لٹیروں کو دی جاتی۔ اللہ تعالیٰ ہر کسی کو جاہل مفتیوں اور قاضیوں سے بچا کر رکھے۔“

حدود آرڈیننس کے مولفین نے عصمت دری کو اگرچہ زنا کی قسم قرار دیتے ہوئے اس کے لیے معیار ثبوت وہی مقرر کیا تھا جو زنا کا ہے، لیکن انہیں اس جرم کی سنگینی کا بھی احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کنوارے مجرم کے لیے بھی سوکڑوں سے زائد سزا، جو سزائے موت بھی ہو سکتی ہے، تجویز کرتے ہیں، البتہ عصمت دری کو زنا قرار دینے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تہا عورت کو بے آبرو کرنے والے لاشعور بد معاشوں کو قانونی تحفظ فراہم ہو جاتا ہے کیوں کہ زنا کا معیار ثبوت ایسا ہے جو شاید دست یاب نہ ہو سکے اور اگر گواہ میسر آ بھی جائیں تو تزکیۃ الشہود کی بھٹی میں ہی بھسم ہو جائیں گے اور عصمتوں کے لٹیروں کے معاشرے میں دندان تے پھریں گے۔ عصمت دری کو زنا قرار دینے سے کئی اور قانونی پیچیدگیاں بھی جنم لیتی ہیں۔ مثلاً کیا جو عورت عصمت دری کا شکار ہوئی ہے، اسے زانیہ کہنا درست ہے؟ کیا کسی مردہ عورت یا کسی جانور سے بد فعلی کرنا بھی موجب حد ہے؟ اس لیے کتاب و سنت کی تصریحات کی روشنی میں ہماری رائے یہ ہے کہ عصمت دری، زنا کی قسم نہیں بلکہ اس سے زیادہ گھناؤنا اور سنگین فعل ہے، یعنی حرامہ۔ عصمت دری کے زنا نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ جرم موجب حد نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا معیار ثبوت اور اس کی سزا وہ نہیں جو زنا کی ہے جس میں ثبوت کے لیے چار چشم دید مسلمان مرد گواہوں کی شرط ہے جو تزکیۃ الشہود کے معیار پر پورے اتریں اور سزا میں کنوارے اور شادی شدہ میں امتیاز ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جرم ان تمام ذرائع سے ثابت ہو جائے گا جن سے جرائم ثابت ہوتے ہیں۔

حرامہ کی سزا قرآن حکیم نے مقرر کر دی ہے اور وہ چار سزائیں ہیں جو سورہ المائدہ آیت ۳۳ میں مذکور ہیں جن کا

مطلب یہ ہے کہ قاضی جرم کی نوعیت، شدت اور حالات کو جانچتے ہوئے ان میں سے کوئی ایک سزا دے دے اور ان میں سزائے موت بھی شامل ہے۔ اس لیے تحفظ نسواں بل میں عصمت دری کو تعزیری جرم قرار دینا قرآن حکیم کی رو سے غلط ہے۔ اسے جرائم حدود میں رکھا جائے اور حدود آرڈیننس میں اس کے ثبوت اور سزا کے حوالے سے تبدیلی کر دی جائے۔

تحفظ نسواں بل میں عصمت دری کو تعزیری جرائم میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ جرم ناقابل ضمانت اور ناقابل مصالحت ہے۔ اس قانون کی تدوین کے دوران اس امر پر بھی غور نہیں کیا گیا کہ اگر کسی شخص پر عصمت دری کا جھوٹا الزام عائد کیا گیا ہو اور عدالت میں مدعیہ کا جھوٹ ثابت ہو جائے یا عصمت دری ثابت نہ ہو سکے تو جھوٹا الزام عائد کرنے پر کیا سزا دی جائے گی؟ جہاں تک قذف کی خود کار سزا کا تعلق ہے، وہ جرم زنا کے عدم ثبوت سے وابستہ ہے نہ کہ عصمت دری کے عدم ثبوت سے۔ موجودہ دفعہ سے اس امر کا اندیشہ بڑھ گیا ہے کہ سیاسی اور دیگر نوعیت کے مخالفین کے خلاف بے بنیاد جنسی الزامات عائد کر کے ان کو سزائیں دلوانے یا ان کا مستقبل تاریک کرنے کے واقعات میں اضافہ ہو جائے گا۔ اب صحت مند انتخابی مہم چلانے کے بجائے مخالف امیدوار کو عصمت دری کے مقدمے میں ملوث کر کے اس سے بآسانی اس طرح نجات حاصل کی جاسکے گی جس طرح ملائیشیا کے ڈپٹی پرائمر منسٹر انور ابراہیم کو ان کی اسلامی خدمات کا صلہ دیتے ہوئے نہ صرف منظر سے ہٹا دیا گیا بلکہ ہمیشہ کے لیے بے آبرو کر دیا گیا۔ کرایہ داروں سے مکان خالی کرانے اور سینئر افسران سے ان کی سیٹ خالی کرانے کے لیے مذکورہ دفعہ اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس امر کا بھی اندیشہ ہے کہ گھریلو خادما سب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر گھر کو پریشانی بنالیں اور اپنے مطالبات پورے نہ ہونے کی صورت میں گھر کے کسی مرد پر عصمت دری کا الزام عائد کر کے ہر گھر کا سکون غارت کر دیں۔ اسلام نے اس کا علاج بھی ساتھ ساتھ دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں ثبوت جرم کے لیے قابل اعتماد ثبوت ہونا ضروری ہے، اور الزام غلط ثابت ہونے پر حد قذف کی خود کار سزا موجود ہے۔

علمائے کرام نے فحاشی کی روک تھام کے لیے یا دوسرے لفظوں میں حدود آرڈیننس میں زنا موجب تعزیری دفعہ کے متبادل کے طور پر مندرجہ ذیل دفعہ تجویز کی تھی:

A man and woman are said to commit lewdness if they willfully have sexual intercourse with one another and shall be punished with imprisonment which may extend to five years and shall also be liable to fine.

”ایک مرد اور عورت اگر اپنی آزادانہ رضامندی سے باہمی جماع کرتے ہیں تو انہیں فحاشی کا مرتکب قرار دیا جائے گا اور انہیں پانچ سال تک سزائے قید دی جائے گی اور جرمانہ بھی کیا جاسکے گا۔“

تحفظ نسواں بل میں اس تجویز کی زبان بہتر کر کے میاں بیوی کو اس جرم سے خارج کر دیا گیا ہے تاہم قانون سازی کی اس ساری سرگرمی میں اس اصل جرم کا کہیں ذکر نہیں ہے جس کے بارے میں موثر قانون سازی کی ضرورت تھی اور جو بنیادی خرابی ہے جسے اسلام بیخ و بن سے اکھاڑ دینا چاہتا ہے، اور وہ ہے ”فحاشی اور بے حیائی کی اشاعت“۔

اسلامی احکام کی رو سے معاشرے میں فحاشی اور بے حیائی کی اشاعت ایک سنگین جرم ہے جس کے بارے میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس کی روک تھام کے لیے قانون سازی کرے اور اشاعت فاحشہ کے مجرموں کو سنگین سزا دے۔

اسلام جہاں چار دیواری کا تحفظ کرتا ہے اور لوگوں کے گناہ تلاش کرنے کے لیے ان کے گھروں میں جھانکنے اور ان کی نجی زندگی کی ٹوہ لینے سے سختی سے منع کرتا ہے، وہاں وہ معاشرے کو پاک صاف رکھنے کے لیے فحاشی کی اشاعت پر پابندی عائد کرتا ہے۔ زنا کے ثبوت کے لیے چار چشم دید گواہوں کی شرط بھی درحقیقت کھلم کھلا فحاشی کے ارتکاب کو روکنے کے لیے ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر چار گواہ موجود نہیں ہیں تو زنا جرم نہیں یا اس کے جرم ہونے کی شدت کم ہو جاتی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر چار گواہ موجود نہیں تو زنا گناہ ہونے کے باوجود ”فحاشی کی اشاعت“ کے زمرے میں نہیں آتا۔ قرآن حکیم نے سورہ النور میں عصمت و عفت کے تحفظ کے قوانین بیان کرتے ہوئے ان قوانین کا مقصد یہی بیان کیا کہ مسلم معاشرے میں فحاشی کی اشاعت نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ (النور: ۲۳: ۱۹)

”جو لوگ اہل ایمان میں فحاشی کی اشاعت کو پسند کرتے ہیں، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔“ حیرت کی بات ہے کہ جن گونا گوں طریقوں سے سرکاری سرپرستی میں بے حیائی اور فحاشی کی اشاعت ہوتی ہے، اس کے سامنے بند باندھنے کے لیے کہیں سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی بلکہ اسے میڈیا کی آزادی کے عنوان سے تحفظ دیا جاتا ہے۔ بے حیائی کی اشاعت جو قرآن کریم کی رو سے اصل برائی ہے، اس کے سد باب کے لیے حدود آرڈیننس میں کوئی دفعہ تھی، نہ تحفظ نسواں ایکٹ میں ہے۔

حدود آرڈیننس اور حقوق نسواں ایکٹ کے گہرے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح اسلامی قانون جرم و سزا کے نفاذ کے بے پایاں شوق کے نتیجے میں مناسب غور و فکر کے بغیر حدود آرڈیننس نافذ کر دیا گیا تھا اور اس میں بہت سی دفعات کتاب و سنت سے متصادم تھیں، اسی طرح اس کی ترمیم و ترمیم کے جذبہ فراواں کے تحت جلد بازی اور افراتفری میں تحفظ نسواں بل پاس کر دیا گیا ہے جس کی کئی ایک دفعات کتاب و سنت کے خلاف ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ قانون سازی دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ اسلامی حوالے سے اس کے لیے کتاب و سنت کے مکمل علم اور ائمہ مجتہدین کی کاوشوں سے آگاہی کے علاوہ معاشرتی روایات، تمدنی ارتقا، فلسفہ قانون، سابقہ قوانین کے اثرات و نتائج اور مجوزہ قوانین کے متوقع اثرات کے بارے میں گہری بصیرت درکار ہوتی ہے۔ حیرت ہے کہ تحفظ نسواں ایکٹ کی کئی ایک دفعات کے کھلم کھلا کتاب و سنت سے متصادم ہونے کے باوجود اسلامی نظریاتی کونسل نے اسے کیسے ”مشرف باسلام“ کر لیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بقول علامہ اقبال۔

خود بدلنے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درجہ فقہان حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق
اگر اس ملک کی ہمہ مقتدر شخصیت اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف یہ بات غلط منسوب کر رہی ہے تو کونسل کو اس کی
وضاحت کرنی چاہیے کیونکہ

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں فقیہ مصلحت میں سے وہ رند بادہ خوار اچھا

علامہ اقبال کا تصور اجتہاد اور علمائے کرام

اقبال بیسویں صدی کے بہت بڑے مفکر، فلسفی، شاعر اور مجتہد تھے۔ بیسویں صدی کے ذکر سے یہ مقصد نہیں ہے کہ اُن کی فکر اسی ایک صدی میں مقید تھی۔ یہ بات اُن کی ذات کے متعلق تو کہی جاسکتی ہے، لیکن جہاں تک اُن کی فکر کا تعلق ہے تو شاید جمود کے اس دور میں بھی اُن کی پرواز میں کوتاہی نہیں آئی ہے۔ اجتہاد کے حوالے سے اقبال کی فکر کی حکمرانی ان کے دور تک محدود نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک ان کی فکر کو صحیح معنوں میں سمجھا نہیں گیا جو بلاشبہ مسلم امہ کے لیے ایک المیہ ہے۔

ماہنامہ 'الشریعہ' نومبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں، اقبال کی فکر کے حوالے سے کئی مضامین سامنے آئے ہیں۔ مذکورہ شمارے کے نصف سے زیادہ صفحات میں فکر اقبال سے متعلق عموماً اور اُن کے اجتہادی نقطہ نظر سے متعلق خصوصاً لکھا گیا۔ رئیس التحریر جناب زاہد الراشدی صاحب نے بھی 'کلمہ حق' کو اقبال کے تصور اجتہاد کے حوالے سے 'چند ضروری گذارشات' کے لیے مختص کیا ہے اور نہایت خوبصورتی سے علامہ اقبال کی فکری، فلسفیانہ، دانشورانہ اور شاعرانہ حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انگریزی استعارے کے دور میں اس فکری خلا کی نشاندہی کی ہے جو مسلمانوں کے جمود کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ یہ مولانا صاحب کی وسیع نظر ہے کہ وہ اس خلا کے وجود کے معترف ہیں، ورنہ ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو کسی فکری خلا کے وجود کے ہی سرے سے انکاری ہیں۔ تاہم مولانا صاحب کا کہنا ہے کہ چونکہ اقبال خود مجتہد اور فقیر نہ تھے اور نہ ہی اجتہاد اور فقہ سے ان کا عملی علاقہ رہا تھا، اس لیے وہ اجتہاد کے عملی پہلوؤں کے حوالے سے اقبال کی آرا پر اپنے تحفظات رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا صاحب نے چند امور کی نشان دہی کی ہے جو بحث طلب ہیں۔ ذیل میں ہم جناب زاہد الراشدی صاحب کے پیش کردہ ان نکات پر ایک نظر ڈالیں گے۔

۱۔ اجتہاد مطلق کا دروازہ بند کیے جانے سے متعلق اقبال کے اعتراض کے جواب میں مولانا صاحب کا ارشاد ہے کہ اس کا تعلق اہلیت و صلاحیت کے فقدان سے نہیں بلکہ ضرورت مکمل ہو جانے سے ہے اور دیگر علوم و فنون کی طرح اجتہاد کے اصول و ضوابط بھی، جو اساسی نوعیت کے ہوتے ہیں، طے ہو چکے ہیں اور غیر متبدل ہیں۔ اس کے خلاف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ دین میں جو چیز بھی ابدی اور اٹل نوعیت کی ہوتی ہے، اس کے لیے قرآن پاک یا سنت نبوی سے صراحت پیش کرنا ہوگی۔ کیا مولانا صاحب اجتہاد مطلق کے متعلق ایسی کوئی تصریح پیش کر سکتے ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ اجتہادی فیصلے چونکہ

☆ ناز شکر اللہ۔ سرانے نورنگ۔ ضلع بنوں

قیاسی اور استنباطی ہوتے ہیں، اس لیے ان کی حتمیت پر اصرار نہیں کیا جاسکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک مسئلے کے حل کے بارے میں ارباب علم متفق نہ ہوں، لیکن ہر حال میں یہ اتفاق ضروری نہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جن اصول و ضوابط کو مولانا صاحب نے ”اساسی قوانین“ کہا ہے، انہیں یہ بنیادی حیثیت کس نے دی ہے؟ اگر وہ فرمائیں کہ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے تو اس ضمن میں یہ پوچھا جائے گا کہ ان پانچ فقہی مذاہب کے علاوہ دیگر میسوں فقہی مذاہب کے پیرو کاروں کے ساتھ، جو ان کے بقول تاریخ کی نذر ہو گئے، اللہ تعالیٰ کیا معاملہ فرمائیں گے؟ انہوں نے بھی تو ان اجتہادات سے انحراف کیا تھا۔ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ان اجتہادات کا اقرار یا انکار صرف تاریخ کا معاملہ نہیں کہ فلاں فقہی مذہب عملی لحاظ سے دوام حاصل کر گیا اور فلاں ناکام ہو گیا، بلکہ یہ ہماری اخروی زندگی سے بھی متعلق ہے۔ ممکن ہے مولانا صاحب اس دور فقہی قوانین کی تشکیل کا عبوری دور قرار دے کر دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے لیے نجات کی راہ نکال لیں مگر میری انجمن یہ ہے کہ یہی دور حتمی کیوں ہے؟ اسلام میں اجتہاد کا وجود اسے ایک متحرک (Dynamic) مذہب ثابت کرتا ہے اور اس تحرک کی بنا پر ہی اسلام تمام زمانوں کے لیے ہے۔ اجتہاد کو فقط ایک دور تک محدود کرنا، اس کی حرکت کو جمود میں تبدیل کرنے کے مترادف ہے۔ شاید الطاف احمد اعظمی صاحب نے اس لیے لکھا ہے کہ:

”قیاسی احکام حالات اور ظروف زمانہ کے تابع ہیں اور ان کی تبدیلی سے وہ بھی تبدیل ہو جائیں گے یا یوں کہہ لیں کہ ان کی اطلاقی صورتیں بدل جائیں گی۔ اس سلسلے میں حنفی فقہ کا رویہ ماضی کی طرح آج بھی قابل اعتراض ہے۔ انہوں نے حنفی فقہ کو، جو زیادہ تر قیاسی اور استدلالی احکام پر مشتمل ہے، ناقابل تغیر سمجھ لیا ہے۔“ (۱)

اگر بقول مولانا صاحب ان اساسی قوانین کی حیثیت اب ناقابل تغیر ہے اور ان کی تشکیل کا فقط ایک ہی دور تھا تو خود حضور نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کے دور ہی میں ان اصول اور ضوابط کو طے کیوں نہیں کر دیا گیا، کیونکہ وہ بہر طور دین کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے تھے۔

۲۔ رئیس التحریر نے لکھا ہے کہ اقبال نے اجتہاد کا خطبہ دیتے وقت ترکی کی جدیدیت کو سامنے رکھا تھا۔ گزارش یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا لکھاری بھی اپنے ماحول سے اوپر اٹھ کر نہیں لکھتا۔ بیسویں صدی کے ریلج اول میں ترکی اندھی تقلید سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لیے تگ و دو کر رہا تھا۔ اقبال نے ترکی کی اس کاوش کو بنظر تحسین دیکھا کیونکہ اقبال کے مطابق مرد مومن اپنی خودی کو اسی وقت مستحکم کر سکتا ہے جب اس میں حریت اور آزادی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہو اور وہ روایات کے شکنجوں کو توڑ سکتا ہو۔ ترکی اس وقت بلاشبہ اس اندھی تقلید کے بت کدوں کو پاش پاش کر رہا تھا۔ ترکوں کے اس اقدام کو اقبال نے یوں سراہا ہے:

”در اصل یہ صرف ترک ہیں جو امام اسلامیہ میں قدامت پرستی کے خواب سے بیدار ہو کر شعور ذات کی نعمت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ صرف ترک ہیں جنہوں نے ذہنی آزادی کا حق طلب کیا ہے اور جو ایک خیالی دنیا سے نکل کر اب عالم حقیقت میں آگئے ہیں۔“ (۲)

اقبال مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے خواہاں تھے اور نشاۃ ثانیہ کے لیے اندھی تقلید سے آزاد ہونا ناگزیر ہے۔ ترکی اس وقت قدامت پسندی کے خلاف لڑ رہا تھا اور اقبال کے مطابق قدامت پسندی اور روایت پرستی ہی مسلم امہ کے زوال کا سبب تھی، چنانچہ ترکوں کی، فرسودہ روایات سے بغاوت اور ان کی عقلی پیش رفت ان کے خیالی دنیا سے نکل کر عالم حقیقت میں

آنے کے مترادف تھی۔ اقبال کا خطبہ اجتہاد محض ترکی کی جدیدیت کی نقالی نہیں ہے۔ انہوں نے ترکی کے مشہور شاعر ضیا سے، جس کا حوالہ بار بار خطبہ اجتہاد میں آیا ہے، جہاں ضروری تھا اختلاف بھی کیا ہے۔ اقبال ترکی کی جدیدیت کے کہاں کہاں خلاف تھے، طوالت کے خوف سے اس بحث سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ اقبال اس اجتہاد کے حق میں تھے جس میں اسلامی روح سرایت کر چکی ہو۔ ترکی اس وقت لاکھوں کدوں کو توڑ چکا تھا، تاہم الاکے معبد تعمیر نہیں کر سکا تھا۔ اس لیے اقبال نے اس غدشے کا اظہار کیا:

”آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے۔ آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور انتشار کی طرف ہوتا ہے، لہذا مسلمیت اور قومیت کے یہی تصورات جو اس وقت دنیائے اسلام میں کارفرما ہیں، اس وسیع سطح نظر کی نفی بھی کر سکتے ہیں جس کی اسلام نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے۔“ (۳)

ترکی کی جس لادینیت کو مولانا صاحب اور الطاف احمد اعظمی صاحب (۴) اقبالی فکر کے شجرہ طوبیٰ کے برگ و بار قرار دیتے ہیں، اقبال نے پیشگی طور پر اس کی اطلاع دے کر ان کے اس خیال باطل کی بساط الٹ دی تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”پھر اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ تمہارے مذہبی اور سیاسی رہنما حریت اور آزادی کے جوش میں، بشرطیکہ اس پر کوئی روک عاید نہ کی گئی، اصلاح کی جائز حدود سے تجاوز کر جائیں۔“ (۵)

اقبال ترکی کی ایسی کسی پیش رفت کو قبول کرنے کے حق میں نہ تھے جس سے وہ اسلامی روحانیت سے محروم ہو جائیں۔ جاوید نامہ کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ترکی کی اس بے مہار آزادی کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے:

| | |
|-----------------------------|--------------------------------|
| مصطفیٰ کو از تجدد می سرود | گفت نقش کہنہ را باید زدود |
| نو نگر دد کعبہ را رخت حیات | گر زافرنگ آیدش لات و منات |
| خُرک را آہنگ نو در چنگ نیست | تازہ اش جز کہنہ افرنگ نیست |
| سینہ او را دے دیگر نبود | در ضمیرش عالے دیگر نبود |
| لاجرم باعالم موجود ساخت | مثل موم از سوز این عالم گداخت |
| طرقگی ہا در نہاد کائنات | نیست از تقلید تقویم حیات |
| زندہ دل خلاق اعصار و دہور | جانش از تقلید گردد بے حضور |
| چوں مسلماناں اگر داری جگر | در ضمیر خویش و در قرآں نگر |
| صد جہان تازہ در آیات او ست | عصر ہا پیچیدہ در آفات او ست |
| یک جہانش عصر حاضر را بس است | گیر اگر در سینہ دل معنی رس است |
| بندۂ مؤمن ز آیات خدا ست | ہر جہاں اندر بر او چوں قبا ست |
| چوں کہنہ گردد جہانے در برش | می دہد قرآں جہانے دیگرش (۶) |

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ کمال اتاترک کے نام کے ساتھ اقبال نے ”ایدۃ اللہ بنصرہ العزیز“ لکھا تھا (۷) مگر جب اس کی جدیدیت دائرہ اسلام سے متجاوز ہونے لگی تو اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ چنانچہ اگر اقبال ترکوں کی آج کی لادینیت کا مشاہدہ فرماتے تو ان کو بھی ویسے ہی ہدف تنقید بناتے جیسا کہ انہوں نے مصطفیٰ کو بنایا۔ اقبال کے سامنے اس

وقت فقط ترکوں کی قدامت پسندی اور روایت پسندی کے خلاف بغاوت تھی اور انہوں نے اُن کے اسی پہلو کو خارجِ تحسین پیش کیا ہے۔

۳۔ مولانا صاحب نے تیسرا نکتہ یہ اٹھایا ہے کہ اقبال کے خطبہ اجتہاد پر پون صدی گزر چکی ہے اور اب دنیائے حالات سے گزر رہی ہے، اس لیے ہمیں اپنے مسائل کو نئے حالات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اس ضمن میں ہماری گزارش یہ ہے کہ جو طبقہ ماضی کے اجتہادات کو حتمی تصور کرتا ہے، وہ جدید عالمی تناظر اور بین الاقوامی ماحول میں اپنی ضروریات اور ترجیحات کا ازسرنو جائزہ کیسے لے سکتا ہے؟ عباسی دور میں مرتب شدہ فقہی اصولوں اور جزیات میں محصور رہ کر جو ’اجتہاد‘ بھی کیا جائے گا، اس کا حشر اس کا نفرنس سے مختلف نہیں ہوگا جو گزشتہ سال بھارت میں ایک مذہبی ادارے نے منعقد کی تھی۔ اس میں ٹیلی ویژن اور تصویر سے متعلق علما کی ’اجتہادی‘ آرا کی ایک جھلک ’الشریعہ کے گزشتہ شماروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ علما ابھی تک اجتہاد کے متعلق اقبال کے موقف کو نہیں سمجھ سکے۔ تاریخ کوئی سیلاب نہیں ہے جو ہنگامی طور پر غارتگری کر کے گزر گیا اور بس۔ اس کی کڑیاں حال اور مستقبل میں پیوست ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ماضی سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ ہم نے حال تو درکنار، ماضی کے مسائل کا حل بھی نہ ڈھونڈا ہو۔ اگر ہم حال کے مسائل پر واقعی غور و فکر کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں اقبال کے اس خطبے کا ازسرنو جائزہ لینا ہوگا اور اس کے متعلق اپنے موقف پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ الطاف احمد اعظمی صاحب نے اقبال کے دوسرے خطبوں کا بہت سخت تنقیدی جائزہ لیا ہے، تاہم اس خطبے میں وہ اقبال سے بڑی حد تک متنقذ دکھائی دیتے ہیں۔ میری نظر میں عصر حاضر کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ علما اجتہاد کا بند روازہ دوبارہ کھولنے کے لیے تگ و دو کریں۔ اسی صورت میں وہ اس فکری خلا کو پُر کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے جو مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ جب تک یہ قدم نہیں اٹھایا جاتا، ہم کواہو کے تیل کی طرح اقبال کے خطبہ اجتہاد ہی کا طواف کرتے رہیں گے۔

حوالہ جات:

- ۱۔ اعظمی، الطاف احمد، ’خطبات اقبال۔ ایک مطالعہ‘ (دارالتذکرہ لاہور، ۲۰۰۵ء) ص: ۲۳۸
- ۲۔ نذیر نیازی، سید (مترجم)، ’تشکیل جدید الہیات اسلامیہ‘، طبع دوم (بزم اقبال، لاہور، ۱۹۸۳ء) ص: ۲۵۰
- ۳۔ ایضاً، ص: ۲۵۱، ۲۵۲
- ۴۔ اعظمی، الطاف احمد، ’خطبات اقبال۔ ایک مطالعہ‘، ص: ۲۱۷
- ۵۔ نذیر نیازی، سید (مترجم)، ’تشکیل جدید الہیات اسلامیہ‘، ص: ۲۵۲
- ۶۔ محمد اقبال، ’جاوید نامہ‘، طبع ہفتم، (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۸ء) ص: ۶۶
- ۷۔ سلیم چشتی، پروفیسر، ’شرح جاوید نامہ‘، طبع اول (عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۵۶ء) ص: ۶۰۱

حدیث نبوی میں 'اخوان' کا مصداق

”الشریعہ“ کے اکتوبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں برادر معمار ناصر صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے مولانا وحید الدین خان صاحب کی ایک تحریر کے حوالے سے ان پر گرفت کی، جس میں مولانا وحید الدین خان صاحب نے اپنے تشکیل کردہ دعوتی فورم سی پی ایس انٹرنیشنل پرنٹنگ کو کی ہے۔

عمار صاحب کی تنقید مولانا پر دو پہلوؤں سے ہے۔ ایک یہ کہ انھوں نے مسلم کی اس روایت کا غلط مطلب سمجھا ہے جو مولانا نے نقل کی ہے۔ زیر بحث اصل روایت، اس کے حوالہ جات اور ترجمہ درج ذیل ہے۔ واضح رہے کہ محدثین کے نزدیک یہ روایات سنداً صحیح ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَى الْمُقْبِرَةَ فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ بِكُمْ لَآحِقُونَ. وَدِدْتُ أَنَا قَدْ رَأَيْتُ أَخَوَانَنَا. قَالُوا: أَوْ لَسْنَا إِخْوَانَكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: أَنْتُمْ أَصْحَابِي، وَأَخَوَانُنَا الَّذِينَ كَمْ يَأْتُوا بَعْدُ.

(مسلم، رقم ۲۳۹۔ ابن خزیمہ، رقم ۶۔ بیہقی، رقم ۷۰۱۔ احمد، رقم ۹۲۸۱۔ ابویعلیٰ، رقم ۶۵۰۲)

”سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک موقع پر) قبرستان تشریف لائے اور آپ نے (مردوں کے لیے دعا کرتے ہوئے) فرمایا: اے مؤمنین کی جماعت، تم پر سلامتی ہو، اور بے شک، اگر اللہ نے چاہا تو ہم بھی تمہارے پیچھے آئے ہی والے ہیں۔ (پھر آپ نے فرمایا: میری بڑی خواہش ہے کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول، کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: تم لوگ تو میرے ساتھی اور رفیق ہو، ہمارے بھائی تو وہ ہیں جو ابھی آئے ہی نہیں ہیں۔“

مولانا نے اس روایت سے یہ سمجھا ہے کہ اس میں اصحاب رسول کے علاوہ بھی ایک خاص گروہ کا ذکر کیا گیا ہے جو بعد کے زمانے میں آئے گا۔ عمار صاحب کی تنقید یہ ہے کہ اس روایت میں کسی خاص گروہ کی پیش گوئی نہیں کی گئی ہے، بلکہ اپنے بعد آنے والے اہل ایمان کو اپنے بھائی کہا گیا ہے۔

عمار صاحب کی دوسری تنقید یہ ہے کہ مولانا نے اس گروہ کا مصداق سی پی ایس انٹرنیشنل کو قرار دیا ہے۔ اس دوسری

☆ صدر دانش سرائی، کراچی۔

بات کا جواب تو خیر مولانا کے ذمہ ہے۔ میرے علم کی حد تک عمار صاحب کی یہ تنقید مولانا تک پہنچ چکی ہے اور امید کی جاسکتی ہے کہ آنے والے ”الرسالہ“ کے کسی شمارے میں وہ اپنا نقطہ نظر بیان کر دیں گے۔ البتہ، ان کی پہلی تنقید چونکہ فہم حدیث سے متعلق ہے، اس لیے اس بارے میں، میں اپنا نقطہ نظر پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میری طالب علمانہ رائے یہ ہے کہ اگر اس حدیث کے الفاظ کی نسبت حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف درست ہے تو اس کے متن کا بغور مطالعہ اسی نتیجے تک پہنچاتا ہے جس تک مولانا وحید الدین خان صاحب پہنچے ہیں۔ یعنی اس روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد آنے والے عام مسلمانوں کی نہیں، بلکہ ان میں سے کچھ خاص لوگوں کی پیش گوئی کی ہے۔ میری بات کے دلائل حسب ذیل ہیں:

اس روایت میں حضور پاک نے بات کا آغاز یہاں سے کیا ہے کہ میری خواہش ہے کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھ لیتے اور آخر میں حضور فرماتے ہیں کہ ہمارے بھائی تو وہ ہیں جو ابھی نہیں آئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان ”اخوان“ کی خصوصیت صرف اتنی ہے کہ وہ حضور کے بعد ایمان لے کر آئیں گے تو حضور کی اس خواہش کی معنویت واضح نہیں ہو پاتی کہ آپ انہیں دیکھ سکیں۔ اس لیے کہ حضور پاک کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ آپ کو ایک روز دنیا سے رخصت ہونا ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ بہر حال اس کے بعد بھی لوگ ایمان لائیں گے۔ اس لیے مجرد طور پر یہ بات کہ اپنے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ایمان لانے والوں کو حضور دیکھ لیں، اپنی معنویت پوری طرح واضح نہیں کر پاتی، سوائے اس کے کہ ان ”اخوان“ کی خصوصیت صاحب ایمان ہونے کے علاوہ مزید کچھ اور بھی ہو۔

پھر عقل عام کی بات یہ ہے کہ حضور کے بعد ایمان لے کر آنا کسی طور پر بھی کوئی اتنی بڑی بات نہیں کہ حضور ایسے لوگوں کے دیدار کے مشتاق ہوں۔ معلوم بات ہے کہ حضور پاک کی زندگی ہی میں اسلام کو وہ عظمت حاصل ہو گئی تھی کہ لوگ جوق در جوق ایمان لارہے تھے۔ خلافت راشدہ اور بعد کے ادوار میں اسلام کو وہ عروج و اقتدار حاصل ہو چکا تھا کہ مسلمان ہو جانا آخرت ہی نہیں، بلکہ دنیا میں بھی نفع کا باعث تھا۔ ایسے میں لوگوں کا اسلام قبول کر لینا یا مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو جانا ان میں کوئی ایسی خصوصیت پیدا نہیں کرتا ہے کہ حضور ان کے دیدار کے مشتاق ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضور نے اخوان کی تعیین یہ کہہ کر نہیں کی کہ یہ لوگ وہ ہیں جو میرے بعد ایمان لائیں گے، بلکہ یہ کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ابھی نہیں آئے۔ یہ اسلوب خود ایک نوعیت کے خصص کو پیدا کر دیتا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ ان بعد میں آنے والوں کو حضور نے اپنے اور صحابہ کرام کے ساتھ یہ کہہ کر منسلک کیا ہے کہ یہ ہمارے بھائی ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضور کے صحابہ ہرگز ہرگز عام لوگ نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے نصرت دین کی ایک انتہائی غیر معمولی خدمت لی ہے۔ جب یہ بات واضح ہے تو پھر آپ سے آپ یہ بات نکلتی ہے کہ ”ہمارے بھائیوں“ کے اس اعلیٰ ترین خطاب کے حق دار کوئی عام لوگ نہیں ہوں گے، بلکہ دین کی خدمت سرانجام دینے والا یہ کوئی خاص گروہ ہی ہوگا۔

رہا سوال یہ کہ اخوان سے مراد کون لوگ ہیں تو یہ ایک ایسی بحث ہے جس میں ایک سے زیادہ آرا ہو سکتی ہیں۔ تاہم میرے نزدیک بلاشک و شبہ مولانا وحید الدین خان صاحب کا یہ موقف بالکل درست ہے کہ اخوان رسول، صحابہ کرام کی طرح ایک خصوصی حیثیت کا گروہ ہے۔ تاہم میری طالب علمانہ رائے میں گروہ کا لفظ استعمال کرنے سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ زیادہ درست الفاظ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں میں سے وہ لوگ ہوں گے جو ہر طرح کے

حالات میں صحیح دین پر قائم رہنے والے اور لوگوں کو اسی کی دعوت دینے والے ہوں گے۔ ان کا زمانہ ایک ساتھ ہونا ضروری نہیں اور یہ بھی لازمی نہیں کہ وہ دنیا میں بھی ایک ہی گروہ کی حیثیت سے متعارف ہوں۔

میری اس رائے کی تائید روایت کا اگلا حصہ کرتا ہے۔ میں اسے ذیل میں نقل کر رہا ہوں:

فَقَالُوا: كَيْفَ تَعْرِفُ مَنْ لَمْ يَأْتِ بِعُدْمٍ مِنْ أُمَّتِكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ فَقَالَ: أَرَأَيْتَ لَوْ أَنَّ رَجُلًا لَهُ خَيْلٌ عَرْمُوحَةٌ بَيْنَ ظَهْرِي خَيْلٍ ذُهُمٌ بِهِمْ، أَلَا يَعْرِفُ خَيْلَهُ؟ قَالُوا: بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ. قَالَ: فَإِنَّهُمْ يَأْتُونَ عُرْمُوحًا مَحْجَلِينَ مِنَ الْوُضُوءِ، وَأَنَا فَرَطُهُمْ عَلَى الْحَوْضِ. أَلَا لَيَذَادَنَّ رَجُلًا عَنْ حَوْضِي كَمَا يَذَادُ الْبَعِيرُ الضَّالُّ، أَنَادِيَهُمْ: أَلَا هَلُمَّ! فَيُقَالُ: إِنَّهُمْ قَدْ بَدَلُوا بَعْدَكَ. فَأَقُولُ: سُحْقًا سُحْقًا.

”پھر انھوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول، آپ کی امت کے جو لوگ ابھی آئے نہیں ہیں، آپ ان کو (قیامت میں) کیسے پہچانیں گے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: اگر انتہائی سیاہ رنگ کے گھوڑوں کے درمیان کسی آدمی کے ایسے گھوڑے موجود ہوں جن کی پیشانیاں اور پاؤں سفید ہوں تو آپ کا کیا خیال ہے، کیا وہ اپنے گھوڑوں کو پہچان نہیں پائے گا؟ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے جواب دیا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا: یہ لوگ اس حال میں آئیں گے کہ وضو کے سب سے ان کی پیشانیاں اور پاؤں سفید اور روشن ہوں گے۔ اور میں ان سے پہلے حوض پر موجود ہوں گا۔ البتہ، یہ بات بھی جان لو کہ کچھ لوگوں کو میرے حوض سے اس طرح واپس دھکیل دیا جائے گا، جس طرح ایک ہٹکنے ہوئے اونٹ کو دھکیل دیا جاتا ہے۔ میں ان کو پکار پکار کر بلا رہا ہوں گا۔ پھر مجھ سے کہا جائے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ کے بعد (دین میں) تبدیلی کر دی تھی۔ (آپ فرماتے ہیں کہ) اس پر میں ان لوگوں سے کہوں گا: بربادی ہو تمہارے لیے، بربادی ہو۔“

اس میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن ان لوگوں کے اعضا، وضو سے روشن ہوں گے اور اس موقع پر کچھ لوگ اور بھی ہوں گے جنہوں نے دین میں تبدیلی کر دی تھی اور انہیں حوض سے دھکیل دیا جائے گا۔ روایت کے یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ ان لوگوں کا زمانہ حضور کے بعد کا وہ دور ہوگا جب دین کے نام پر کھڑے ہوئے لوگ اصل دین میں تبدیلی کر چکے ہوں گے۔ یہ لوگ دین کی حقیقت اور اصل تعلیم پر پردے ڈال دیں گے۔ ایسے میں کہ جب دین کے نام پر دوسری چیزیں رائج ہو چکی ہوں، اصل دین کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا نصرت دین کا سب سے بڑا کام ہے۔ دین کی تعلیمات بدلنے کی یہ کوشش مختلف زمانوں میں کی گئی ہے، اس لیے ہر دور کے ایسے لوگ اس خوش خبری میں شامل ہیں جو صحیح دین پر قائم رہے اور اسے ہی لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔ اس آخری زمانے میں چونکہ یہ سانحہ بہت بڑے پیمانے پر پیش آیا ہے اور اب اصل دین لوگوں کے سامنے پیش کرنا انتہائی مشکل ہو چکا ہے، اس لیے اس زمانے کے صلحا اس خوش خبری کے سب سے بڑھ کر حق دار ہیں۔ یہ مضمون کم و بیش وہی ہے جو امام مسلم نے فسطویٰ للغریاء والی روایت میں بیان کیا ہے۔

یہاں کاروہید الدین خان صاحب کی طرح صاحب نگاہ اور صاحب قلم ہے اور تہ عمار صاحب کی طرح صاحب علم ہے، مگر امید ہے کہ اس عاجز کی بات واضح ہوگئی ہوگی۔

ذبیح حضرت اسماعیل یا حضرت اسحاق؟

پروفیسر میاں انعام الرحمن صاحب کے پرتائیر قلم سے وقتاً فوقتاً علمی و فکری تحریرات صفحہ قرطاس پر منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک تحریر ”قرآنی علمیات اور مسلم رویہ“ کے عنوان سے الشریعہ، جنوری ۲۰۰۶ء میں پڑھنے کو ملی جس میں ذبیح کون کی بحث کے حوالے سے پروفیسر صاحب نے مسلم اہل علم پر تنقید کی ہے۔ پروفیسر صاحب کا موقف یہ ہے کہ اگر ذبیح کو قرآن نے مشخص نہیں کیا تو ہم کیوں ایک اضافی چیز کو کھینچ کر تان کر یقین کے زمرے میں لانا چاہتے اور اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح کے طور پر متعین کرنا چاہتے ہیں۔

گویا بحث کا بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا ہمیں ”ذبیح کون“ کی بحث میں پڑنا چاہیے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ذبیح کون کی بحث سے مقصود حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام کے مقابلے میں برتر ثابت کرنا نہیں اور نہ ہی کوئی مسلمان اس بات کا تصور کر سکتا ہے، بلکہ اس بحث سے مقصود حقائق کو واضح کرنا ہے۔ متعلقہ قرآنی آیات کے منشا کو درست طور پر سمجھنے کے لیے اس بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل ہیں یا حضرت اسحاق علیہما السلام۔ اب جب ہم قرآن مجید پر غور کرتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ قرآن نے ذبیح کا نام نہیں لیا لیکن جو اسلوب

اختیار کیا ہے، اس سے حضرت اسماعیل ہی ذبیح قرار پاتے ہیں۔ قرآن مجید کی متعلقہ آیات حسب ذیل ہیں:

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ - فَبَشِّرْهُ بِبُحَيْرٍ حَلِيمٍ - فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَى قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ - فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ - وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ - قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ - إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ - وَفَدَيْنَاهُ بِذَبْحٍ عَظِيمٍ - وَتَرَكَنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ - سَلَامٌ عَلَيَّ وَإِبْرَاهِيمَ - كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ - إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ - وَبَشِّرْنَا بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ - وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَى إِسْحَاقَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ (صافات آیات ۱۰۰ تا ۱۱۳)

☆ معلم مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔

”اے پروردگار بخش دے مجھے نیکوں میں سے (کوئی بیٹا)۔ پس ہم نے بشارت دی اس کو ایک لڑکے کی جو نہایت بردبار تھا۔ پس جب پہنچا اس کے ساتھ تلک و دو کی عمر کو تو اس نے کہا اے بیٹے، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، پس تو دیکھ کہ تیری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا، اے ابا جان آپ کر ڈالیں جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ آپ مجھے پائیں گے، اگر اللہ نے چاہا، صبر کرنے والوں میں سے۔ پس جب وہ دونوں مطہج ہو گئے (اللہ کے حکم کے) اور گردایا اس کو پیشانی کے بل اور ہم نے اس کو آواز دی، اے ابراہیم، تحقیق تو نے سچ کر دکھایا خواب۔ بے شک ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں نیکی کرنے والوں کو۔ بے شک یہ بات البتہ صریح آزمائش ہے۔ اور ہم نے اس کو ذبح عظیم عطا کیا۔ اور ہم نے چھوڑا اس پر پچھلوں میں۔ سلامتی ہو ابراہیم پر۔ اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں نیکی کرنے والوں کو۔ بے شک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے ہے۔ اور ہم نے بشارت دی اس کو اسحاق کی جو کہ اللہ کا نبی اور نیکوں میں سے ہوگا اور برکت نازل کی ہم نے اس پر اور اسحاق پر۔ اور ان دونوں کی اولاد میں سے نیکی کرنے والے ہیں اور کچھ ظلم کرنے والے ہیں اپنے نفس پر صریح طور پر۔“

پروفیسر صاحب نے آیت ۱۰۵ تک لکھ کر یہ کہا ہے کہ متاخرین کے ہاں وہ انتہا پسندی نظر آتی ہے جو یہودیوں کے نسلی رویے کے متوازی چلتے ہوئے قرآنی علمیا تی تہج کو تہس نہس کر دیتی ہے۔ اگر پروفیسر صاحب آیت ۱۰۷ سے ۱۱۳ تک کا بھی مطالعہ کرتے تو انھیں مفسرین پر تنقید کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی کیونکہ ان آیات میں قرآن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مختصر سوانح پیش کر رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو بت پرستی سے روکا اور انہیں وحدانیت کی تبلیغ کی، پھر آپ نے اپنی بت پرست قوم کو چھوڑ کر ترک وطن کا راستہ اختیار کیا۔ اس سارے واقعے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ’رب هب لى من الصالحين‘ کے الفاظ سے دعا کی جس کے بدلے میں پروردگار نے ’غلام حلیم‘ کی خوشخبری سنائی۔ پھر جب بچہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آزمائش آئی اور انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اس آزمائش میں کامیابی پر ذات خداوندی نے ذبح عظیم عطا فرمایا۔ بیٹے کی قربانی کی آزمائش اور اس پر انعام و اکرام کے ذکر کے متصل بعد دوسری بشارت کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے کہ ’و بشرناہ باسحق نبیاً من الصالحین‘۔ گویا ان آیات میں دو بیٹوں کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ پہلی خوشخبری ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے بعد بیٹے کا نام لیے بغیر دی گئی۔ اس کے بعد واقعہ قربانی کا ذکر کیا گیا جو کہ اسی غلام حلیم کے ساتھ پیش آیا۔ اس واقعے کے متصل بعد دوسری بشارت اسحاق علیہ السلام کے متعلق دی گئی۔ یعنی قرآن نے بشارت اول کو ذبح کے ساتھ منسلک کیا ہے جبکہ بشارت ثانی کا ذکر قربانی کے واقعے کے بعد کیا، جس سے واضح ہے کہ قربانی کا واقعہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے ساتھ پیش نہیں آیا۔

مزید قابل غور امر یہ ہے کہ پہلی بشارت ’غلام حلیم‘ کے جبکہ دوسری بشارت ’نبیاً من الصالحین‘ کے الفاظ سے دی گئی۔ سورۃ ہود میں یہ دوسری بشارت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

وَأَمْرًا تَهُ قَائِمَةٌ فَضَحَكْتُ فَبَشَّرْنَاَهَا بِإِسْحَاقَ وَمِنْ وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ (ہود، ۷۱)

یعنی غلام حلیم کے ساتھ کسی قسم کا وعدہ نہیں، نہ نبی صالح ہونے کا اور نہ آگے نسل چلنے کا، جبکہ بشارت ثانی (اسحاق) کے ساتھ نبی صالح ہونے اور اگلی نسل، دونوں کا وعدہ کیا گیا۔

علاوہ ازیں پہلی بشارت حضرت ابراہیم کی دعا کے نتیجے میں دی گئی جبکہ دوسری بشارت دعا کا نتیجہ تھی بلکہ اس پر ابراہیم علیہ السلام نے ان الفاظ میں تعجب ظاہر کیا:

أَبَشَّرْتُمُونِي عَلَى أَنْ مَسَّنِيَ الْكَبِيرُ فَبِمَ تَبَشَّرُونَ (الحجر، ۵۴)

اس طرح حضرت سارہ کے الفاظ تھے:

يَا وَيْلَتَى أَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهَذَا بَعْلِي شَيْخًا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ (ہود، ۷۲)

اب اگر ان بشارتوں کو خدائی قانون 'لا تبدیل لکلمت اللہ' کے تحت سمجھا جائے تو 'ذبیح کون' کی بحث بڑی عمدگی سے حل ہو سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر ذبیح حضرت اسحاق کو مانا جائے تو یہ خدائی قانون کے خلاف ہے، کیونکہ اللہ رب العزت اس سے پہلے ان کی نسل آگے چلنے اور نبی صالح ہونے کا وعدہ فرما چکے ہیں، پس اسحاق علیہ السلام کو نبوت دینے اور نسل کے جاری کرنے سے پہلے ہی قربان کر دینے کا حکم دینا اس سے پہلے کیے گئے دونوں وعدہ کی خلاف ورزی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قربانی کرنے کا حکم حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی سے متعلق تھا۔

پروفیسر صاحب سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا اسرائیلیات کو انہی حدود میں استعمال کیا گیا ہے جو قرآن و سنت نے مقرر کی ہیں؟ تو گزارش ہے کہ واقعی اس معاملے میں مفسرین نے احتیاط برتی ہے اور اسرائیلیات کو انہی حدود میں استعمال کیا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے 'حدیثو عن بنی اسرائیل ولا حرج' میں مقرر فرمائی ہیں، یعنی ایسی روایات جو قرآن و سنت کی تائید کرتی ہیں اور عقل سلیم کے منافی بھی نہیں، ان کو مفسرین تائید کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح قرار دینے میں بھی قرآنی اسلوب کو ہی مد نظر رکھا گیا ہے، جبکہ اسرائیلیات کو صرف تائید کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

پروفیسر صاحب کا یہ اعتراض بھی ہے کہ اگر قربانی کے واقعے میں اسماعیل علیہ السلام کا نام شامل ہوتا تو معترضین کو پھبتیاں کسے کا موقع ملتا کہ اسلام دعویٰ تو عالمگیریت کا کرتا ہے لیکن اصلاً اسماعیلی ہے۔ اسی طرح اگر اسحاق علیہ السلام کا نام ہوتا تو یہودیوں کی نسل پرستی کو مزید شہ ملتی۔ لیکن اگر غور کریں تو قرآن نے حضرت اسماعیل کی بشارت صرف 'غلام حلیم' کے الفاظ سے دی ہے جبکہ حضرت اسحاق کی بشارت 'نبیسا من الصالحین' کے الفاظ سے دی ہے۔ یعنی حضرت اسماعیل پہلے پیدا ہوئے اور نبوت کی بشارت بعد میں ملی، جبکہ اسحاق علیہ السلام پیدا بعد میں ہوئے اور نبوت کی بشارت پہلے ملی۔ ان میں سے ہر دو حضرات کی اپنی اپنی خصوصیت ہے۔ ذبیح ہونا حضرت اسماعیل کی خصوصیت ہے، جبکہ پیدائش سے پہلے نبوت کی بشارت مل جانا اسحاق علیہ السلام کی خصوصیت ہے۔ قرآن نے معترضین کو پھبتی کسے کا موقع ہی نہیں دیا کیونکہ نبوت کی بشارت کامل جانا زیادہ اونچا مقام ہے، نہ کہ نبوت کے بغیر محض ذبیح ہونا۔ اس کے بعد بھی اگر معترضین پھبتیاں کسیں تو ہمیں ان کی پروا نہیں کرنی چاہیے کیونکہ پھبتیاں کسنے والوں نے تو انبیاء کرام کو بھی نہیں چھوڑا۔

الشریحہ، جولائی ۲۰۰۶ء میں پروفیسر صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے اسحاق علیہ السلام کے ذبیح ہونے کا قول منقول ہے اور اکثر علما کا یہی قول ہے، اور کچھ لوگ اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کے قائل ہیں۔ گزارش ہے کہ ہم وہ روایتیں لینے کے مکلف نہیں جن میں اسحاق علیہ السلام کے ذبیح ہونے کا ذکر ہے کیونکہ یہ بات قرآنی منشا سے متصادم ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور ان لوگوں کی اکثریت جن سے اسحاق علیہ السلام کے ذبیح ہونے کی روایتیں مروی ہیں، ان سے اسماعیل کے ذبیح ہونے کی روایتیں بھی موجود ہیں، اور قرآنی منشا بھی یہی ہے اور اسی پر متقدمین و متاخرین کا ایک جم غفیر متفق ہے۔

مکاتیب

(1)

مکرمی مدیر الشریعہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

’الشریعہ‘ کے دسمبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں میاں انعام الرحمن صاحب کا مضمون ”قدامت پسندوں کا تصور اجتہاد“ دیکھنے کا موقع ملا۔ میاں صاحب کی تحریریں ندرت اور تازگی کی وجہ سے ہمیشہ ہی لائق توجہ ہوتی ہیں، مگر ان کے موضوعات میرے لیے زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں ہوتے، اس وجہ سے میں ان کو زیادہ توجہ نہیں دے سکا۔ اس مضمون کی کاٹ کے حوالے سے ایک دوست کے توجہ دلانے پر مضمون کو پڑھا تو ان کی جرات و جسارت کا اعتراف کرنا پڑا۔ الشریعہ کی مجلس ادارت کے رکن اول ہوتے ہوئے ادارہ کے رئیس التحریر کے انداز فکر اور اس حلقے کے انتہائی محترم بزرگوں پر موصوف نے جس طرح تنقید کی، اس سے موصوف کے والد مرحوم کی یاد تازہ ہو گئی۔ مرحوم کا وہ بنگ طرز عمل جانا پچھانا ہے۔ میاں صاحب نے سپوت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اپنے حلقے اور ماحول میں تنقید کی جسارت کبھی خوشگوار نہیں رہی۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ یقیناً یہ انہی کا حصہ ہے۔ مضمون میں میاں انعام صاحب نے جتنا بے لاگ طرز اختیار کیا ہے، وہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ان کے بعض جملوں کا اعادہ کیا جائے۔ اس کے بغیر ان کی تحریر کا بانگ پین قاری پر واضح نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ میرا منتہی تحریر میں احترام کی حدود سے تجاوز کو کھلے لائنسنس کے طور پر لینا نہیں، بلکہ تحریر کے پس منظر میں حریت فکر کو جاگر کرنا ہے۔ اس میں بھی ادارہ ’الشریعہ‘ نے جس تحمل اور بردباری سے اتنے جری مضمون کو پرچے میں جگہ دی ہے، وہ تحسین و داد کا جس قدر مستحق ہے، وہ اپنے مقام پر آئے گی۔ میاں انعام صاحب کے چند جملے ملاحظہ کیجیے:

”جناب تقی صاحب ایک رسمی معاشرتی رویے کی نشان دہی کو اصولی و قانونی حوالے سے دیکھ رہے ہیں اور خرد کو جنوں اور جنوں کو خرد کہے جا رہے ہیں۔“

”زاہد الراشدی صاحب کی تحریر کا جو اقتباس ہم نے نقل کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ وہ ایک منحصے میں گرفتار ہیں۔“

”دیکھنے کی ضرورت باقی ہے کہ قدامت پسند، اجتہاد مطلق سے اتنا کیوں بدکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی خاص نفسیاتی سرحدیں ہیں، جنہیں عبور کرنے سے وہ معذور ہیں۔“

”قدامت پسند اہل مدرسہ، جن کی نمائندگی زاہد صاحب کر رہے ہیں، ہمیشہ پورا سچ قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں اور تعامل امت میں کارفرما تاریخی عوامل کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔“

”زاہد صاحب کا یہ فقرہ ایک پوری مدرسہ ذہنیت کی نمائندگی کر رہا ہے۔“

یہ جملے نمونے کے طور پر ہیں۔ میاں انعام صاحب نے اپنے نقطہ نظر کو پورے زور سے پیش کیا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو یقیناً خیالات کی روپریا یہ اظہار اختیار نہ کر پاتی۔ ان کا ذہن پورے طور پر سامنے نہ آتا۔ اس میں اصل قدر اور وزن کی چیز خیالات ہیں۔ ظاہری رکھ رکھاؤ اور سوچ و فکر میں سے کس کو ترجیح حاصل ہے، اس بارے میں دو آرا کی گنجائش نہیں۔ سوچ اور فکر کو ترجیح بھی حاصل ہے اور اسے راہ دینا ہی چاہیے۔ خاص طور پر آپس داری میں تو اس کی رعایت کوئی احسان والی بات بھی خیال نہیں کرنا چاہیے۔ اقبال نے شاید ایسے ہی مواقع پر کہا ہے:

رمز میں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی

ہر رمز نہیں بیباک، ہر عشق نہیں گستاخ

ادارے نے اسی جذبے کے تحت انعام صاحب کو اظہار کا پورا موقع دیا ہے۔ ادارہ ان کے مضمون کو ایڈٹ کر کے ایسے جملوں کو نرم کر سکتا تھا۔ یہ ادارے کا فطری حق تھا۔ ہر پرچے کی تحریر کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اسے استوار رکھنے کا ادارہ مجاز ہوتا ہے، مگر ادارے نے ایسا کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے زور بیان میں کمی کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ پھر سوچ اور فکر کے بیان میں لکھنے والے کے ذہن اور بیان میں بعد بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ادارے نے لکھنے والے کے منصب میں کسی طرح مداخلت نہیں کی۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ لکھنے والے کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ اس میں وہ اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کا داعیہ اپنے اندر خود ہی محسوس کرتا ہے۔ اسے ایسی چھوٹی موٹی کوتاہیوں کی جانب توجہ دلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ انعام صاحب اپنی تحریروں میں اتنی جریت کے عادی نہیں۔ موضوع کے لحاظ سے وہ اپنی گرد و پیش کے ماحول میں سخت بیزار کی حالت میں رہے ہیں۔ ایسے میں بات کو روایتی رکھ رکھاؤ سے پیش کرنے میں دعوت فکر کمزور پڑ جاتی ہے۔ بعض اوقات ذہنی جمود کو توڑنے کے لیے مخاطب کو ذہنی صدمہ سے دوچار کر کے ذہن کو بیدار کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح میں انعام صاحب کی جرات و جسارت کی کھل کر داد دینا چاہتا ہوں۔ میں ان کے لکھنے کی آزادی کا دفاع کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ مگر یہاں دفاع کی ضرورت کیسے ہوئی؟ ادارہ تو پہلے ہی اس کا اہتمام کر رہا ہے۔

اس سلسلے میں ادارے کی جانب سے جس مریدانہ شفقت کا مظاہرہ کیا گیا ہے، اس کی داد دینے کے ساتھ ساتھ افادیت کا ذکر کرنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں۔ میں ۱۹۹۲ء سے الشریعہ کا قاری ہوں۔ اس عرصہ میں یہ پرچہ جن مراحل سے گزرا ہے، وہ میرے سامنے ہے۔ اسی آزادی کا ثمر ہے کہ اس میں لکھنے والوں کی بھرمار ہے۔ مجھ جیسا شخص بھی جسے لکھنے کے لیے یکسوئی میسر نہیں، ادارے کی جانب سے حوصلہ افزا محبت کی وجہ سے کبھی کبھی لکھنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی پرچے میں خطوط کے صفحات لکھنے والوں کے لیے بہترین زسری ہوتے ہیں۔ اس طرح قاری ادارے کے خیالات اور بیان میں حصہ دار ہو جاتا ہے۔ یہ شراکت اور حصہ داری ہی کام میں وسعت کا سبب بنتی ہے۔

میرے لیے ادارے کے ذمہ داران کی جانب سے ہمیشہ ہی بلند حوصلگی کا جو مظاہرہ ہوا ہے، وہ میرے لیے حیران کن ہے۔ میں اپنے ماحول سے بیزار اور ماحول مجھ سے بیزار رہا ہے، مگر یہاں مجھے جو محبت اور شفقت ملی، اس کا عشرِ عشر بھی اپنے حلقے میں مل جاتا تو شاید اب تک میں پرسکون موت کی وادی میں ہوتا۔ ماحول کی ناسازی نے مجھے ماحول کا فسوں توڑنے کے لیے آمادہ کیا اور میں اس کے لیے ہمیشہ برس پیکار رہا۔ اقبال کے شعر کو ہمیشہ میں نے حرز جاں بنائے رکھا:

حدیث بے خبراں ہے زمانہ باتو بساز

ایسی شفقت (انعام صاحب کے کہنے کے مطابق) ”مدرسی ذہنیت“ والوں کی جانب سے کمال و جمال کی انتہا ہے۔ دراصل یہ کیفیت مدرسے کے بجائے مدرسانہ مزاج کا خاصہ ہے جو جدید پڑھے لکھے طبقے کے ہاں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ وہاں بالعموم دنیاوی کشش نسبتاً زیادہ زور آوری ہوتی ہے۔ اس کا تلخ مظاہرہ حال ہی میں ماہنامہ ’ترجمان القرآن‘ کے رویے سے ہوا۔ بے شک اس کی مجلس ادارت میں بیٹھے ہوئے لوگ، جدید تعلیم کے اعلیٰ ترین مدارج طے کیے ہوئے ہیں، مگر تنگ بینی و تنگ نظری کا ایسا مظاہرہ ہوا کہ سیاسی لحاظ سے بھی یہ بہت بے جوڑ محسوس ہوا۔

’الشریعہ‘ اور ’ترجمان‘ کا موازنہ ایک مذاق معلوم ہوتا ہے، مگر بعض اوقات مذاق بچ ہو جاتا ہے۔ اس موازنے میں کچھ ایسے ہی آثار نظر آتے ہیں۔ دونوں کی عمر معلوم کرنے والی بات ہے۔ فرق کا اندازہ ایک اور اڑھائی کا ہے۔ سرکولیشن میں بھی بعد ایشرفین معلوم ہوتا ہے۔ لکھاری بھی ایک جانب پرانے علمائے اور دوسری جانب نہایت پڑھے لکھے اور جدید تعلیمی اداروں سے تعلیم کی ڈگریاں سجائے اور روشن خیالی اور قلم و قسطاس کے ذہنی۔ وسائل بھی بظاہر اسی تفاوت کے ساتھ۔ موسس کے لحاظ سے ترجمان، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے بین الاقوامی مفکر سے منسوب، جب کہ ادھر مولانا سرفراز خان صاحب صفر کو دینی خدمات کے لیے پہاڑوں کی چوٹیوں سے انتر کر گوجرانوالہ میں بسیرا کیے ہوئے نصف صدی ہونے کو ہے۔ دونوں کی ضخامت میں بھی ایک اور تین کا تناسب ہے۔ بعض باتیں مشترک بھی ہیں۔ ’الشریعہ‘ میں تمام تر سخت مولانا زاہد المرشدی کی نظر آتی ہے۔ انہوں نے گھر کے افراد اور احباب کے ساتھ سفر شروع کیا، ان کی تربیت انہی کی ذمہ داری قرار پائی۔ دوسری طرف سید مرحوم کا خلوص و ایثار بنیادی اثاثہ تھا اور اپنے ساتھیوں کو تیار کرنا تھا۔ بہر حال میں تاریخ کے بجائے تازہ صورت حال پر بات کروں گا۔

ہوا یوں کہ جون ۲۰۰۶ء کے ’ترجمان‘ کے شمارے میں ’مجلس عمل کی پارلیمانی پارٹی کی جدوجہد‘ کے عنوان سے محترم جناب لیاقت بلوچ صاحب کا ایک مفصل مضمون شائع ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ موضوع کوئی علمی نوعیت کا نہیں، نہ اس میں عقیدے یا نظریے کو لمبا چوڑا دخل ہے۔ پارلیمانی جدوجہد کوئی ایسی بھی نہیں کہی جاسکتی کہ اس پر کلام نہ ہو سکتا ہو۔ چنانچہ میں نے اس کے حوالے سے ایک خط میں چند سوالات کی وضاحت چاہی۔ میرا خط ’ترجمان‘ میں جگہ نہ پاسکا۔ ارباب ’الشریعہ‘ کی مہربانی سے اسے جگہ مل گئی۔ ایک مہینے کے سکوت کے بعد نائب مدیر ترجمان القرآن جناب مسلم سجاد صاحب نے میرے سوالات کی اشاعت پر اعتراض کرتے ہوئے مدیر الشریعہ کو نصیحت فرمائی کہ ان کے ہاں چھپی ہوئی چیز کے بارے میں نقد چھاپنے سے پہلے لیاقت صاحب کا مضمون چھاپنا چاہیے تھا۔ مسلم صاحب کی نصیحت ’الشریعہ‘ میں شائع کر دی گئی۔ سوچنے کی بات ہے کہ ’ترجمان القرآن‘ جیسے پرچے کے ترجمان کس طرح دوہرے معیار کی بات کرتے ہیں۔ اپنے ہاں تو وہ چھاپی ہوئی چیز پر اپنے دیرینہ قاری کو کسی درجے میں جگہ دینے کو تیار نہیں، مگر دوسروں سے توقع رکھتے ہیں کہ ان کو جگہ دی جائے۔ اس سے زیادہ معقول بات تو یہ ہو سکتی تھی کہ ’ترجمان‘ کی جانب سے میرے شائع شدہ مضمون کا جواب بھجوا یا جاتا۔ بہر حال ارباب ’ترجمان‘ عرش نشین ہیں، مرضی کے مالک ہیں، مگر ان کی من مرضی اپنے نتائج پیدا کرنے سے تو رک نہیں جائے گی۔ ایک اور بات اس مرحلہ میں ذکر کر دوں کہ میرے مضمون کو روزنامہ پاکستان نے ’الشریعہ‘ سے نقل کر دیا۔ کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ مسلم سجاد صاحب اجازت دیں تو ان کا خط روزنامہ پاکستان کو بھی اشاعت کے لیے بھجوا دیا جائے؟

میں ذکر کر رہا تھا ارباب 'ترجمان' کے جامد رویے اور اس کے نتائج کا۔ مجھے دکھ ہے کہ اتنا بڑا پرچہ اشتہارات، اشارات، اور کتابوں پر تبصروں کے بعد چھپی ہوئی تحریروں سے اپنا پیٹ بھر کر گزارا کرتا ہے۔ ان کو لکھنے والے ہی نہیں ملتے۔ مسلم سجاد صاحب خرم مراد صاحب کے بھائی تو ہیں مگر خرم صاحب مرحوم کا نعم البدل اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہو جاتا تو شاید آج محترم جناب خورشید احمد صاحب کو اپنی ضعیفی کے باوجود بے شمار ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اشارات گھسنے نہ پڑتے۔ معلوم نہیں، ان کے اشارات میں پاگل پن کے درجے کی جذباتیت کو کون داخل کرتا ہے۔ ترجمان کے تازہ شمارے میں مولانا محمد تقی عثمانی صاحب تو لکھتے ہیں کہ حقوق نسواں کے حوالے سے متنازعہ بل کے قانونی مضمرات کو قانونی باریکیوں کا فہم رکھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ سنجیدگی اور حقیقت پسندی سے غور کی دعوت دیتے ہیں، مگر محترم پروفیسر خورشید صاحب اشارات کا عنوان ہی 'حدود اللہ کے خلاف اعلان جنگ' قائم کرتے ہیں۔ ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ پولیس کے پہرے میں محصور چھوٹی سی ریلی میں کی گئی تفریق نقل کردی گئی ہو۔ بہر حال یہاں اشارات پر گفتگو مقصود نہیں۔ یہ اندیشہ بھی ہے کہ مسلم صاحب اشارات پر دو چارج حملے ہو جانے پر ناراض ہو کر یہ مطالبہ داغ دیں کہ ان سے پہلے اشارات نقل کیے جائیں۔

میرے مضمون کے حوالے سے میرے ایک عزیز خرم شہزاد صاحب نے اٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات دیے ہیں۔ مجھے ان کے احساسات کی قدر ہے۔ میں ان کے خط پر یہاں بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خیال تھا کہ ان کو خط لکھوں مگر معلوم ہوا کہ خط کے نیچے درج پتہ کا موٹی کا ہے اور وہ کراچی منتقل ہو گئے ہیں۔ ان کا کراچی کا پتہ معلوم نہیں ہو سکا۔ دراصل میرے خط کا منشا مجلس عمل کی کارکردگی کو زیر بحث لانا نہیں تھا۔ میں نے بنیادی سوال یہ اٹھایا تھا کہ ترجمان القرآن ایک علمی، دینی، نظریاتی پرچہ ہے۔ اسے رہنما کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں پروپیگنڈے کی سطح کی چیزوں کی گنجائش نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ادارے نے اس کی ضرورت کسی مجبوری کے تحت محسوس کی ہے تو پھر اسے کھلے عام مباحثے کی دعوت کے ساتھ پیش کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے خط میں صاف لکھا تھا کہ ترجمان کو ایک ہفت روزے کی سطح پر نہیں آنا چاہیے۔ میرے عزیز خرم صاحب میرے مضمون کا دوسرا پیرا دیکھ لیں تو مہربانی ہوگی۔ باقی مجلس عمل کی پارلیمانی کارکردگی کے بارے میں خرم صاحب کے خیالات کو 'الشریعہ' میں جگہ دی گئی، اس پر میں خرم صاحب اور ادارہ دونوں کا شکر گزار ہوں۔

'ترجمان' کو لکھ کر میں ان کے جامد رویے کی جانب توجہ دلا نا چاہتا تھا۔ میرے خط کا مقصد ایک دیرینہ قاری کے طور پر خیر خواہی تھا۔ میرے لیے یہ بہت دکھ کی بات ہے کہ ترجمان اپنے حلقے میں لکھنے والوں کی نرسری تیار کرنے میں بری طرح ناکام ہوا ہے۔ 'ترجمان' کی کثرت اشاعت تو ماشاء اللہ روز افزوں ہے، مگر اس کا معیار محل نظر ہے۔ دراصل نقد اور تنقید کو جگہ نہ دی جائے تو حرکت اور زندگی کی علامات معدوم ہو جاتی ہیں۔ 'الشریعہ' میں ان کی پرورش کی جاتی ہے۔ نتیجہ سامنے ہے کہ پچھلے چند سالوں میں لکھنے والوں کی کھیپ تیار ہے۔ ان کے ساتھیوں میں نوجوانوں کی پوری ٹیم ہے۔ مجھے تو ان نوجوانوں کی نیاز مندی میں بھی لطف محسوس ہوتا ہے۔

بات ہو رہی تھی نقد و تنقید کی۔ بڑا عجیب رویہ ہے۔ صدر مملکت، وزیر اعظم ہر روز فرماتے ہیں کہ فوج اور عدلیہ پر تنقید نہیں ہو سکتی۔ یہ قومی ادارے ہیں۔ ان کا احترام لازم ہے۔ یہ مقدس گائے کے درجے میں ہیں۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے بیانات پڑھ کر سلطان راہی یاد آ جاتے ہیں۔ معمولی نوعیت کے تھانے کی سطح کے کینوں کا خیابان بلوغ کی طرح نوٹس لیا جاتا ہے، مگر وہ مقدمات جن سے ہر شہری کا حق متاثر ہوتا ہے، ان میں کوئی قابل ذکر نکتہ بھی نہیں، عشروں سے محروم

توجہ ہیں۔ ”انصاف ہر ایک کے لیے“ کی کانفرنس کے باوجود کورٹ فیس سے متعلقہ اپیل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کیا بنا ہے اور کیا بنے گا۔ اسمبلی کی مدت پوری ہو رہی ہے مگر قومی اسمبلی کے ارکان کے سندرکس کا فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ چار سال سے یہ لوگ قومی خزانے سے کروڑوں کے معاوضے اور مراعات لے رہے ہیں، مگر ان کی اہلیت کا مسئلہ سپریم کورٹ میں بدستور معرض التوا میں ہے۔ اردو کو ۱۹۸۸ء تک سرکاری سطح پر رواج دینے کا عمل مکمل ہو جانا لازم تھا مگر اس دستوری تقاضے کا کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ میری معلومات کے مطابق لاہور ہائیکورٹ میں درخواستیں طویل مدت سے پڑی ہیں۔ کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ سود کی لعنت کے بارے میں مقدمات بھی دفن معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ادارے عام آدمی کو کچھ نہ دے سکیں تو اشتہاری مہم جیسی کارکردگی سے کیا فائدہ؟ پھر بات کی جائے تو تنقید سے بالاتر ہونے کا استحقاق جتلا یا جائے۔

صدر اور ان سے نیچے کے لوگ کہتے ہیں کہ مثبت اور تعمیری تنقید ہونی چاہیے۔ منفی اور غیر تعمیری تنقید نہیں ہونی چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ مثبت اور منفی قابل تقسیم کیسے ہو گئے؟ مثبت اور منفی پہلوں کو ایک اکائی بنتے ہیں۔ ان کی تقسیم کس طرح ممکن ہے؟ تخریب کے بغیر تعمیر کیسے ہوگی؟ تخریب اور تعمیر تو لازم ملزوم ہیں۔ لگتا ہے کہ ارباب حل و عقد تنقید کا معنی ہی نہیں جانتے۔ اس سے مراد کھرے اور کھولے کو الگ الگ کرنا ہوتا ہے۔ اچھائیاں اور برائیاں دونوں بیان کی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ تعریف اور قصیدہ گوئی کے ماہر ہوتے ہیں اور کچھ کو تصویر کا دوسرا رخ دکھانے کی آزادی ڈنی چاہیے۔

تنقید روکنے کے بارے میں ارباب اقتدار کا رویہ اوپر ذکر ہو چکا، جماعتوں کو دیکھا جائے تو وہاں بات دو ہاتھ اور بھی آگے ہے۔ وہ کہتے ہیں اطاعت کی جائے۔ کام کیا جائے۔ صم بکم عمی فہم لایرجعون کا معیار اختیار کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کے ماحول میں کیا تنقید کے لیے قبرستان کا رخ کرنا چاہیے کہ شاید وہاں پرفٹن مردے تنقید پر عذر نہ کریں؟

ادارہ الشریعہ کو مبارک باد کر کے اپنی بات کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ یقیناً انہوں نے انعام صاحب ہی نہیں، ان جیسے کئی اور لکھنے والوں کے حوصلوں کا جلا بخشنے کا سامان کیا ہے۔ انہوں نے اپنے منصب کی شان کو بلند کیا ہے۔ ارباب ترجمان القرآن عرش سے نیچے اتر کر معروضی حالات کو دیکھنا گوارا کریں تو الشریعہ جیسے چھوٹے سے پرچے سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر یہ ان کی اپنی صوابدید ہے۔ کسی جبر کا کوئی سوال نہیں۔

چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ
عابد کالونی۔ کھوکھر کی۔ گوجرانوالہ

(۲)

محترم و مکرم حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب،
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ پاک کی ذات عالی سے امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

عرض ہے کہ آپ کے موقر جریدے ماہنامہ الشریعہ کے شمارہ اکتوبر ۲۰۰۶ء میں مشتاق احمد نام کے کسی صاحب کا خط شائع ہوا ہے جو مدرسہ اکتین للذہبات کا خادم ہونے کا مدعی ہے۔ صاحب موصوف نے بزرگ خود حضرات علمائے کرام کو ان کی ذمہ داریاں سمجھائی ہیں اور دعوت و تبلیغ کے کام کو اپنے خیالات کے لیے بطور ہتھیار اور ڈھال کے استعمال کیا ہے۔ خط کے

مندرجات بھی کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ کوئی خادم مدرسہ تو درکنار، ایک عام دینی سوجھ بوجھ رکھنے والا بھی ایسا نہ لکھے گا۔ اللہ پاک محفوظ رکھے۔ آمین! گزارش ہے کہ نہ تو اس نام کے کوئی صاحب مدرسہ الحسین للذینات میں کسی حیثیت میں کسی خدمت پر مامور ہیں اور نہ اس خط کے مندرجات کو دعوت اور تبلیغ کے کام سے کوئی تعلق ہے۔ یہ تحریر بظاہر لکھنے والے کے اپنے احساسات و خیالات کی ترجمانی ہے، نہ کہ دعوت و تبلیغ کے مبارک کام کی جو عام مسلمان کا بھی اکرام کرنے کا داعی ہے، چہ جائیکہ علماء کرام! اللہ پاک آپ حضرات کی دین متین کی سر بلندی کے لیے کی جانے والی کوششوں کو بہت ہی قبول فرمائے اور آپ کی توجہات سے ہمیں محروم نہ فرمائے۔ آمین!

(مولانا طارق جمیل)

۱۲۲ ربی، گلستان کالونی، فیصل آباد

(۳)

گرامی قدر جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب

سلام مسنون مزاج گرامی؟

مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے کہ آپ ’فکر اسلامی‘ کے ایک بحرنا پیداکنار سے اتر کر فقہ کی تنگنائے میں شناوری کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اخبارات اور ’الشریعہ‘ سے علما کا موقف معلوم ہوا تو حیرت ہوئی کہ تحفظ نسواں ایکٹ کی اصل خرابیوں کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ اس پر چند معروضات لکھ کر ’نوائے وقت‘ کو ارسال کیں تاکہ علما کی فوری توجہ حاصل کر سکیں، لیکن وہاں جس قطع و برید اور اقساط سے طبع ہو رہی ہیں، اس سے ان کی افادیت کم ہو گئی ہے۔ مزید برآں ’الشریعہ‘ جن حلقوں میں اور جس سنجیدگی سے پڑھا جاتا ہے، وہ روزناموں کو کہاں نصیب! اس لیے سوچا کہ آپ کو ارسال کر دوں، اگر طبع ہو سکیں تو زبے نصیب۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ڈاکٹر) محمد طفیل ہاشمی

ہاؤس ۱۸۹، سٹریٹ ۱۹، گلشن خداداد

ای ایون ون۔ اسلام آباد

(۴)

مکرمی ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب

علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہمدردی کا شکریہ! مگر میرے سامنے فقہ کی تنگنائے سے کہیں زیادہ مغربی فلسفہ و ثقافت کا وہ طوفان ہے جو اسلام کی تعبیر و تشریح کے روایتی فریم ورک کو توڑ کر مسلم معاشرہ میں اپنے اثر و نفوذ کو وسیع کرنے میں پوری قوت کے ساتھ مصروف ہے، اس لیے میں کسی ایسی وسعت اور روشن خیالی کا ساتھ دینے کے لیے خود کو تیار نہیں پاتا جو مغرب کے اس ایجنڈے میں کسی حوالے سے بھی پیش رفت کے لیے معاون بن سکتا ہو۔ باقی ’الشریعہ‘ آپ کا اپنا جریدہ ہے۔ جب چاہیں، آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہے۔ شکریہ!

ابوعمار زاہد الراشدی

مولانا صفی الرحمن مبارک پوریؒ

عالم اسلام کے معروف عالم دین، نامور سیرت نگار، محدث، مدرس، مصنف، مورخ، مناظر اور ادیب مولانا صفی الرحمن مبارک پوریؒ یکم دسمبر ۲۰۰۶ کو اپنے آبائی قصبے حسین پور (مبارک پور، اعظم گڑھ، انڈیا) میں پندرہ برس انتقال فرما گئے۔ جناب صفی الرحمن مبارک پوری کی پیدائش ۱۹۳۲ء کے وسط میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم مبارک پور کے مدرسہ دارالتعلیم اور مدرسہ احیاء العلوم میں ہوئی۔ بعد ازاں مدرسہ فیض عام، میو (یوپی) میں عربی زبان و قواعد اور تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ وغیرہ شرعی علوم میں مہارت حاصل کی اور ان مضامین کے امتحانات میں امتیازی حیثیت میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۶۱ء میں ضلع الہ آباد اور پھر ناگ پور میں درس و تدریس اور تقریر و خطابت کا مشغلہ اختیار کیا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کے مختلف مدارس میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۷۸ء میں سیرت پران کی مشہور کتاب ”الرحیق المختوم“ کو عالمی ایوارڈ ملا تو عرب کے علمی حلقوں میں متعارف ہوئے جس کی بنا پر جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ کے ذیلی شعبے مرکز السیرۃ النبویہ میں بطور محقق کام کرنے کا موقع ملا۔ بعد ازاں وہ مکتبہ دارالسلام، ریاض سے وابستہ ہو گئے اور وہیں صحیح مسلم کی عربی شرح ’مئنة المنعم‘ تصنیف کی۔

مولانا مرحوم کی عالم گیر شہرت کی اصل وجہ ان کی مایہ ناز تصنیف ”الرحیق المختوم“ ہے جسے ۱۹۷۸ء میں رابطۃ العالم الاسلامی کے زیر اہتمام مقالات سیرت کے مقابلے میں پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ یہ کتاب اصلاً انھوں نے عربی زبان میں لکھی اور بعد ازاں خود ہی اس کو اردو زبان کے قالب میں ڈھالا۔ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو عربی اور اردو، ہر دو زبانوں میں انشا و تحریر کا عمدہ ذوق اور سلیقہ عطا کیا تھا۔ قدیم و جدید مصادر سیرت سے اخذ و انتخاب اور تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں سے بھی مالا مال تھے۔ بایں وجہ ”الرحیق المختوم“ نے اردو ادب سیرت میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ اس کتاب کا شمار اردو زبان کی محقق، مستند اور شاہکار کتب سیرت میں ہوتا ہے۔ مرحوم کی دیگر تصانیف میں ’صحف یہود و نصاریٰ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارتیں‘، ’تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب‘، ’تاریخ آل سعود‘، ’قادیانیت اپنے آپ سے کہنے میں‘، ’فتنہ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرتسری‘، ’انکار حدیث کیوں؟‘ اور بلوغ المرام کی عربی وارد و شرح ’اتحاف الکرام‘ اہم ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو ان کی دینی و دعوتی خدمات کا اچھا صلہ عطا فرمائیں۔ آمین

☆ لیکچرر شعبہ علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف سرگودھا۔

الشريعة اکادمی کی سرگرمیاں

☆ الشريعة اکادمی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام ۲۰۰۶-۲۰۰۷ کے تعلیمی و تربیتی پروگرام کے تحت علماء، اساتذہ اور طلبہ کے لیے اکادمی کے ڈائریکٹر مولانا زاہد الراشدی کے ہفتہ وار تربیتی لیکچرز کے سلسلے کا آغاز ہو گیا ہے۔ اس ضمن میں پہلا لیکچر ۱۶ دسمبر بروز ہفتہ کو ”تحفظ حقوق نسواں بل“ کے تاریخی و فکری پس منظر کے حوالے سے دیا گیا۔ جس میں مختلف اداروں سے تعلق رکھنے والے علماء اور طلبہ شریک ہوئے اور موضوع سے گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے سوالات اٹھائے۔ تربیتی لیکچرز کے اس سلسلے کے لیے ہفتے کے دن مغرب کی نماز کے نصف گھنٹہ بعد کا وقت مقرر کیا گیا ہے۔

☆ علماء و اساتذہ کی علمی و فکری تربیت اور پیش آمدہ مسائل پر سنجیدہ بحث و مباحثہ کو فروغ دینے کے لیے اکادمی کے زیر اہتمام ایک ہفتہ وار مذاکراتی نشست کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا ہے جس میں تعلیم و تدریس اور دیگر سماجی و معاشرتی شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہل فکر متعین عنوانات پر تبادلہ خیال کریں گے۔ اس سلسلے میں ابتدائی مشاورتی اجلاس ۱۶ دسمبر کو اکادمی میں منعقد ہوا جس میں اس نشست کے لیے ہفتے کے دن بعد از نماز عشا کا وقت مقرر کرنے پر اتفاق رائے کیا گیا۔

☆ الشريعة اکادمی کے زیر اہتمام کورونائے (عقب و اپڈاٹاؤن) گوجرانوالہ میں مدرسہ طیبہ تحفیظ القرآن میں قرآن کریم حفظ و ناظرہ کی کلاس شروع کر دی گئی ہے جس میں قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ مڈل تک اسکول کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔ قاری محمد آصف مہر صاحب کو کلاس کا انچارج مقرر کیا گیا ہے۔

☆ میر پور، ڈھاکہ کے دارالرشاد کے مہتمم مولانا سلمان ندوی ۲۴ نومبر ۲۰۰۶ کو الشريعة اکادمی میں تشریف لائے اور ایک خصوصی نشست میں علماء اور اساتذہ کے ساتھ تعلیمی امور پر تفصیلی بات چیت کی۔ احباب نے ان سے بنگلہ دیش کے دینی مدارس کے نصاب و نظام اور طریق کار کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

انا لله وانا اليه راجعون

☆ الشريعة اکادمی کے ناظم مولانا حافظ محمد یوسف کی والدہ محترمہ طویل علالت کے بعد ۲۱ دسمبر بروز جمعرات انتقال فرما گئیں۔ مرحومہ بے حد نیک، شب زندہ دار اور صابروشا کرا خاتون تھیں۔

☆ حافظ محمد عاطف صاحب کے نانا محترم محمد غلام رسول ولد محمد قطب دین مرحوم ۱۱ دسمبر بروز پیر انتقال کر گئے۔ مرحوم صوم و صلوة کے پابند اور دین دار بزرگ تھے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحومین کی مغفرت فرمائیں، درجات بلند فرمائیں اور ان کے سایہ شفقت سے محرومی پر پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔ آمین